معارف

مئی ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پرروانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضروردیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پردی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۷ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

الامین ایجوکیشنل سوسائٹی اوراس کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کے بارے میں بہت پہلے سے بہت کچھ سنتا رہا تھا۔مگر دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔اکثر دیکھنے کے بعد سنی ہوئی باتیں غلط یا مبالغہ آمیز ثابت ہوتی ہیں۔لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ سنا تھا وہ کم تھا اور حقیقت واقعہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔گذشتہ دنوں جب بنگلور جانے کا اتفاق ہوا تو یہی تجربہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب اوران کی قائم کردہ الامین سوسائٹی کے بارے میں ہوا۔الامین آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج کے شعبہ اردو نے ۳۰/ مارچ کو''سرسید۔جدید ہندوستان کے معمار'' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔صدر شعبہ اردو اوراس سیمینار کی کنوینر پروفیسر سعیدہ بیگم نے کلیدی خطبہ کے لیے راقم حروف کو مدعو کیا۔مجھے خوشی ہے کہ بعض موانع کے باوجود میں بنگلور گیا۔وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا وہ زندگی کے خوش گوار ترین تجربوں میں سے ایک تھا۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب سے ملاقات کی خوشی بھی حاصل ہوئی۔خدمت، ایثار، قربانی، بےنفسی اور ساتھ ہی غیر معمولی بصیرت وانتظامی صلاحیت اور عزم وحوصلہ کا ایسا نمونہ کہاں ملے گا۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کا تعلق تامل ناڈو کے مشہور شہر ترچی کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ والد اور والدہ دونوں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔قرینِ قیاس ہے کہ گھر میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے چرچے رہتے رہے ہوں گے۔زیادہ امکان یہی ہے کہ قومی خدمت کی ضرورت اوراہمیت کا پہلا نقش ان کے دل ودماغ میں گھر کے ماحول کی وجہ سے بچپن ہی میں بیٹھ گیا ہوگا۔انہوں نے اپنے لیے میڈیکل لائن کا انتخاب کیا۔ ایم۔بی،بی۔ایس کرنے کے بعد اسی کالج میں تدریسی خدمت کے ساتھ ساتھ ایم۔ایس میں داخلہ بھی لے لیا۔ ایک سرجن کی حیثیت سے ان کے سامنے مستقبل کے بڑے روشن امکانات رہے ہوں گے۔ان کے اپنے کچھ منصوبے اور خواب رہے ہوں گے۔ان کے اہل خانہ اور متعلقین کی بھی ان کی ذات سے بہت سے توقعات وابستہ رہی ہوں گی۔لیکن قضا وقدر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔کاتبِ تقدیر نے ان کے لیے اس سے کہیں بڑی جولان گاہ منتخب کر رکھی تھی۔جس کے مقدر میں قوم وملت کی مسیحائی لکھ دی گئی تھی اسے کہیں اور کہاں تشفی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جب ایک ابھرتے ہوئے سرجن کی حیثیت سے ان کے سامنے امکانات کی ایک وسیع دنیا تھی، انہوں نے زندگی کو قوم وملت کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا غیر معمولی فیصلہ کیا اور ذاتی مفادات کو قربان کر کے اس کانٹے بھرے راستے کا انتخاب کیا۔بات یہ ہے کہ احساس کی دولت سب کو نہیں ملتی، دوسروں کے درد کو اپنا

درد سمجھنے کی سعادت سب کو نصیب نہیں ہوتی، دوسروں کے زخم پر مرہم رکھنے اور دوسروں کی آنکھوں سے آنسو پوچھنے کا جذبہ اور حوصلہ سب کو نہیں ملتا، قوم کے لیے جینے اور مرنے کی آرزو سب کا مقدر نہیں ہوتی۔ اور جس کو یہ دولت مل جاتی ہے اس کی نظروں میں دنیا کی ساری دولت ہیچ ہو کے رہ جاتی ہے۔ ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انہوں نے یہ راز پا لیا تھا کہ مسلم قوم کی پس ماندگی اور زبوں حالی کا اصل سبب تعلیم سے اس کی دوری ہے اور اسے اس کے درمیان تعلیم کے فروغ ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ان کی پوری زندگی اسی مقصد کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس کے حصول کے لیے انہوں نے بنگلور میں جو اب ان کی مستقل رہائش گاہ بن چکا تھا، ۱۹۶۶ء میں الامین ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس نے جلد ہی الامین ایجوکیشنل موومنٹ کی صورت اختیار کر لی۔ گذشتہ سال اس تنظیم نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیے۔ ان پچاس برسوں میں اس تنظیم نے اپنے بانی کی قیادت میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے اور کسی بھی تنظیم کے لیے باعث فخر ہے۔ احسان مند قوم محبت اور عقیدت سے ان کو بجا طور پر بابائے تعلیم اور جانشینِ سرسید کے القاب سے یاد کرتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب عمر کی ۸۲ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ضعف اور کئی بیماریوں کے باوجود نشاط کار کا وہی عالم ہے۔ اس طویل اور پر مشقت سفر میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن انہوں نے ان کو کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ نگاہیں ہمیشہ منزل پر جمی رہیں اور قدم برابر آگے بڑھتے رہے۔ اب زندگی کی شام میں جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوں گے تو انہیں غیر معمولی آسودگی کا احساس ہوتا ہوگا، ایسی سچی خوشی جو مدۃ العمر کی خدمت اور قربانی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

حاصلِ عمر نثار رہ یارے کردم ‌ ‌ ‌ ‌ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اس وقت ان کی رہنمائی اور نگرانی میں چھوٹے بڑے ۲۰۰ سو ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کی غالب اکثریت کرناٹک کے حدود میں کام کر رہی ہے لیکن الامین ایجوکیشنل سوسائٹی کی فیض رسانی کا سلسلہ کرناٹک تک محدود نہیں ہے۔ کئی ادارے کرناٹک کے حدود سے باہر ملک کے دوسرے حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں ابتدائی تعلیم کے مراکز بھی شامل ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی، میڈیکل کالج بھی ہیں اور انجینئرنگ کالج بھی، منیجمنٹ اور فارمیسی کالج بھی ہیں اور ٹیچر ٹریننگ کالج بھی، اسپتال بھی ہیں اور مالیاتی ادارے بھی اور ساتھ ہی ذرائع ابلاغ کے ادارے بھی۔ ملت کی تعلیم اور ہمہ جہت ترقی کے لیے جن وسائل کی ضرورت تھی ان سب کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پچاس سال پہلے جو سفر انہوں نے تنہا شروع کیا تھا وہ ایک عظیم الشان کارواں کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا گیا اور افق تا بہ افق روشنی پھیلتی چلی گئی اور اللہ تعالیٰ

کے فضل وکرم سے اس کا دائرہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔اس سے کتنے گھر روشن ہوئے اور کتنی زندگیاں سنور گئیں اس کا حساب تو صرف احکم الحاکمین کو معلوم ہے اور یقین ہے کہ اس کے یہاں بے حساب اجران کا منتظر ہوگا۔سید حامد صاحب نے ان کو A rare role model کا خطاب دیا تھا۔اس کی سچائی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ تادیر ان کو سلامت رکھے اور روشنی کا یہ سفر جاری رہے اور ان کے لگائے ہوئے اس شجرہ طیبہ کی شاخیں بڑھتی اور پھیلتی چلی جائیں،آمین۔

معارف صدی سیمینار کا مختصر ذکر گذشتہ شمارہ میں آچکا ہے۔اس شمارہ میں اس سے متعلق رپورٹ شامل ہے۔معارف کے ایک صدی کا سفر مکمل کرنے کی مناسبت سے دارالمصنّفین سے باہر جو پروگرام منعقد ہوئے ان میں پہلا پروگرام جشن معارف تھا جو ۳۰/اکتوبر ۲۰۱۶ء کو شفیق میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام نجیب آباد میں منعقد ہوا۔اس کا موضوع ''معارف کا سوسال کا سفر۔اردو صحافت کا سنگ میل'' تھا۔اس کی کسی قدر تفصیل ان صفحات میں آچکی ہے۔اس سلسلہ کا دوسرا پروگرام الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے زیر اہتمام ۲۸/مارچ ۲۰۱۷ء کو منعقد ہوا۔یہ دراصل اس سال کا پروفیسر رفیق میموریل لکچر تھا۔اس کے لیے معارف کے شریک مدیر مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔اس کا موضوع ''عربی اور فارسی زبان وادب کے فروغ میں معارف کا حصہ'' تھا۔اس جلسہ کی صدارت الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رتن لال ہنگلو نے کی۔اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے معارف کی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا اور دونوں اداروں کے درمیان علمی تعاون کی ضرورت پر بھی زور دیا۔اس سلسلہ کے دو پروگرام کلکتہ اور مالدہ یونیورسٹی میں منعقد ہوئے۔کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے اشتراک سے ۱۰/اپریل کو معارف کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں صدر شعبہ عربی پروفیسر اشارت علی ملّا اور صدر شعبہ فارسی پروفیسر بدیع الزماں موجود تھے۔۸/اپریل کو ایسا ہی پروگرام مالدہ یونیورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی کے اشتراک اور پروفیسر نجم الحق اور پروفیسر مہدی حسن کے اہتمام میں ہوا۔دونوں جگہ موضوع وہی تھا جو الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھا اور مقرر مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب تھے۔ان تینوں پروگراموں میں اساتذہ اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور دارالمصنّفین اور معارف کے سلسلہ میں بڑی دلچسپی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔امید ہے کہ یہ اس سلسلہ کے آخری پروگرام نہیں تھے۔توقع کی جانی چاہیے کہ خاص طور سے وہ ادارے جن کا علامہ شبلی اور دارالمصنّفین سے گہرا تعلق رہا ہے وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے۔اس تناظر میں یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ مختلف جامعات میں عربی اور فارسی کے شعبوں نے اس باب میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے لیکن ابھی تک کسی بھی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے اس طرح کا کوئی پروگرام منعقد نہیں کیا ہے۔یہ یقیناً افسوس ناک ہے۔

مقالات

حافظ ابن حجر العسقلانی اور ان کا نادر نسخہ "ہدی الساری" (نسخۂ کاندھلہ)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

(۴)

ہدی الساری نسخۂ کاندھلہ کا مفصل تعارف، مکتوبہ محرم الحرام ۸۲۰ھ، کاتب،

سن کتابت، حافظ کی تحریریں، سماعات، بلاغات، اجازات اور تصحیحات و اضافات۔

تحقیق متن میں کون سے نسخوں پر اعتماد کیا جانا چاہیے، ایک اصول! اوپر آچکا ہے کہ کسی بھی کتاب کے وہ نسخے اہم ترین اور بنیادی ہوتے ہیں جو:

۱۔ مصنف کے قلم سے ہوں، مصنف نے ان کی تصحیح کی ہو، ان سے پڑھا ہو یا اس نسخہ پر اپنے قلم سے بلاغات و سماعات رقم فرمائی ہوں۔

۲۔ یا ایسا نسخہ ہو جو مصنف کے کسی شاگرد نے مصنف کے نسخہ سے نقل کیا ہو۔

اگر کسی ایک نسخے میں یہ تمام اوصاف جمع ہوجائیں کہ اس کو مصنف کے شاگرد نے مصنف کے نسخہ سے نقل کیا ہو، اس کو مصنف نے لمبے عرصہ تک اپنے سامنے رکھا ہو، اس میں برسوں تک اضافے کیے ہوں، ترمیم و تغیر فرمایا ہو اور پھر اسی نسخہ سے اپنے کسی شاگرد کو پڑھایا بھی ہو اور اس پر مصنف کے قلم سے بلاغات اور اجازت بھی تحریر ہوں، تو نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح و تحقیق کے وقت، ایسا نسخہ فنی، علمی قدر و قیمت، استنادی حیثیت اور تاریخی مرتبہ میں ہر اک نسخہ سے بلند ہوتا ہے۔ جس نسخہ میں یہ تمام خصوصیات موجود ہوں گی، جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو، وہ دوسرے نسخوں سے فائق شمار کیا جائے گا، دوسرا کوئی نسخہ اعتبار و استناد میں، اس نسخہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ فارسی زبان کے ایک بہت ممتاز

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویان، کاندھلہ، شاملی (مظفر نگر) یوپی۔ Email:nhrashidkandhlavi@yahoo.com

اور باریک بیں محقق، ناقد اور مصنف پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس موضوع پر اپنے خطبات میں ایک بہت پتہ کی بات کہی ہے:

> ''تحقیق متن میں سب سے اہم نسخہ وہ ہے جو مصنف کا اپنا نسخہ رہا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً مصنف نے خود تیار کیا ہے، مصنف نے کسی سے نقل کرایا ہے اور پھر وہ اس کی نظر سے گذرا ہے، یہ دوسری صورت پہلی سے زیادہ قابل توجہ ہے، اس لیے کہ جس طرح کاتب سے غلطی ہوجاتی ہے مصنف سے نقل میں غلطی کا بخوبی امکان رہتا ہے، ہم روز دیکھتے ہیں کہ لکھنا کچھ چاہتے ہیں اور لکھ کچھ جاتے ہیں''۔(۱)

اس لیے بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ ہدی الساری کا نسخہ کاندھلہ، مکتوبہ ۸۲۰ھ ہے، اسی قسم کا اعلیٰ درجہ کا نسخہ ہے، جس کو دوسرے معلوم خطی نسخوں میں اپنی صفات اور علمی امتیازات کی وجہ سے سب سے فائق اور اعلیٰ ترین نسخہ شمار کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ ہدی الساری کا ایک مخطوطہ اس سے بھی پرانا دریافت ہوا ہے، جو کتب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ میں ہے، مگر وہ نسخہ اول سے ناقص ہے اور اس کے ناقل کی مصنف سے نسبت معلوم نہیں اور اس پر ایسی کوئی تحریر بھی نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ اس نسخہ سے مصنف نے پڑھایا ہے، کسی کو اس کی اجازت دی ہے یا مصنف کے نسخہ سے نقل ہوا ہے، یا اس کو مصنف کے کسی شاگرد نے نقل کیا ہے۔ اس لیے اس نسخہ کا امتیاز صرف اس کی قدامت اور سنہ کتابت ہے۔

اس نسخہ کے بعد دنیا بھر میں معلوم ہدی الساری کے نسخوں میں سب سے قدیم نسخۂ کاندھلہ ہے، جو محرم الحرام ۸۲۰ھ میں ہدی الساری کی تالیف کے صرف سات سال بعد مصنف کے نسخہ سے نقل کیا گیا تھا، یعنی نسخہ کاندھلہ بنیادی طور پر حافظ ابن حجر کے ہدی الساری کے ابتدائی مسودہ کی نقل ہے۔ اس نسخہ کو حافظ صاحب کے سامنے درس میں سبقاً سبقاً پڑھا گیا، پڑھنے والے پڑھتے رہے اور حافظ اصل سے اس کا مقابلہ کرتے رہے، حافظ نے اس نسخہ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے: ''**وأنا ممسک بالأصل**''۔

اس کے بعد سے یہ نسخہ حافظ ابن حجر کی زندگی کے تقریباً آخری سالوں تک حافظ کی توجہات کا محور رہا۔ مصنف کے غالباً سب سے آخری افادات اس میں درج ہوگئے ہیں۔ اس کے ایک حاشیے

میں صراحت ہے کہ یہ اضافہ ۸۴۹ھ میں یعنی حافظ کی وفات سے صرف تین سال پہلے ہوا تھا، اس پہلو سے اس کو ہدی الساری کا مصنف کی تحریر و تصحیح سے آراستہ آخری مکمل نسخہ کہنا چاہیے۔

اس نسخہ کے لکھنے والے نے صراحت نہیں کی مگر اس کے الفاظ سے جھلکتا ہے کہ وہ حافظ ابن حجر کا شاگرد ہے۔ اس نے لکھا ہے:

"لشیخنا الامام حافظ العصر........"

ترقیمۂ کاتب: مکمل ترقیمۂ کاتب درج ذیل ہے۔ اس کے کاتب نے لکھا ہے کہ میں نے اس نسخہ کی مصنف کے نسخہ سے مدرسہ ناصریہ، (۲) قاہرہ میں یوم الاحد کی صبح ۲۵ رمحرم الحرام ۸۳۰ھ (۱۵ / مارچ ۱۴۱۵ء) کو نقل مکمل کی۔ کتاب مکمل کرنے کی تاریخ واضح لفظوں میں لکھی ہے۔ کاتب کے انداز تحریر اور اس کے الفاظ سے جھلک رہا ہے کہ اس نسخہ کا نقل کرنے والا حضرت مصنف سے خاص قربت اور ذاتی تعلق رکھتا ہے۔ ترقیمۂ کاتب درج ذیل ہے:

> آخر المقدمة المتعلقة بشرح البخاري، لشيخنا حافظ العصر مفتي الأنام، عمدة المحدثين، مقتدیٰ الأئمة الأعلام، العالم العلامة، شهاب الملة و الدين، أبي الفضل أحمد بن الشيخ الإمام علاء الدين أبي الحسن علي بن محمد بن محمد بن علي العسقلاني، الشافعي، الشهير بابن حجر أدام الله بهجته و حرس للأنام مهجته۔
>
> إنّي كتبت هذه النسخة من نسخة (كتبت من نسخة (۳)) المصنف المشار إليه۔ ووافق الفراغ منها، في نهار الأحد خامس عشرين المحرم الحرام، عام عشرين و ثمانمائة، بالمدرسة الناصرية، بين العصرين و ما بعدها۔
>
> على يد أفقر عباد الله، محمد بن أبي الجاه الحضرمي، سليمان داؤد الصابي الحلبي۔
>
> غفر الله لكاتبها وقارئها ومطالعها ولوالديهم ولجميع المسلمين آمين، الحمد لله رب العالمين و صلى الله على عبده محمد

و آله و صحبه أجمعين و سلم۔

اس عبارت میں ایک ترمیم اور اس کی حقیقت: اصل نسخہ کی تحریر و تکمیل کے بعد کاتب نسخہ کی تحریر میں معمولی سی ترمیم یا اضافہ کیا گیا ہے۔ کاتب کی عبارت اور الفاظ مسلسل ہیں، حروف میں فاصلہ نہیں ہے۔ مگر بعد میں کسی شخص نے کاتب کے الفاظ: **من نسخة المؤلف** کے اوپر اور نیچے کی سطروں کے درمیان ایک لفظ: **كتبت** اور نیچے کی سطر میں: **من نسخة** لکھ دیا ہے، اس طرح سے یہ فقرہ اصل نسخہ کی عبارت پر اضافہ، جسارت بے جواز اور نسخہ مصنف کو نقصان پہنچانے کی ایک کوشش معلوم ہوتی ہے۔

اس فقرہ کا غلط ہونا بالکل واضح اور صاف ہے، کیونکہ حضرت مصنف نے اس نسخہ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا، اس پر کثرت سے تقریباً ہر ایک صفحہ پر اضافے کیے، اس میں پڑھایا اور اپنے نسخہ میں مصنف جو زیادہ سے زیادہ اضافہ، ترمیم و تغیر ہو سکتا ہے اس کی کوشش فرمائی اور تصرفات و اصلاحات کیے۔ اس قسم کی کوشش اسی وقت ممکن ہے، جب یہ نسخہ خود مصنف کے نسخہ کی نقل ہو اور اس پر مصنف کو اپنے لکھے ہوئے نسخہ جیسا اعتماد ہو۔ جس نسخہ کا مصنف سے دو دو واسطوں یا زیادہ فاصلہ ہو، مصنّفین اپنی کتابوں کے ایسے نسخوں پر توجہ اور ان سے اعتناء نہیں فرمایا کرتے۔ حاصل یہ ہے کہ اس عبارت میں جو حرف نقل ہوئے ہیں: كتبت من نسخة المصنف یہ بعد کا اضافہ ہے۔ یہ الفاظ اصل نسخہ کے کاتب محمد بن ابی الجاہ الحضرمی کے نہیں ہیں، اس فقرہ کی وجہ سے اس نسخہ کی اصلیت و استناد پر شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

اوراق و سطور: یہ نسخہ (۲۷×۱۷) سینٹی میٹر ناپ کے دو سو سینتیس اوراق (چار سو بہتر صفحات) پر مشتمل ہے، ابتدائی کتابت و ترتیب میں صفحات کے آخر میں صرف ترکہ (صفحہ کی عبارت کے بعد دوسرے صفحہ کے ایک دو ابتدائی کلمات کا اشارہ) لکھا ہوا ہے۔ اوراق پر جو نمبر شمار درج ہیں، ان کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اوراق کا یہ شمار بھی حضرت مصنف کے قلم سے ہے۔ اکثر موقعوں پر اس کی روشنائی اور قلم وہی ہے جو حافظ ابن حجر کے قلم کی پہچان ہے، مگر خیال یہ ہے کہ یہ شمار یا اوراق کے نمبر، حاشیے اور نئی عبارتیں لکھنے کے بعد ڈالے گئے ہیں، ورق (۱۴۵۔ الف) اور ورق (۱۷۹۔ الف) دیکھیے تو ان سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ حاشیہ لکھنے کے بعد لگائے گئے ہیں، شمار لکھنے کی مقررہ جگہ حاشیہ کے استعمال میں آ گئی تھیں، اس لیے یہ نمبر دوسری جانب یا درمیان میں ڈال دیے گئے، حالانکہ

پوری کتاب میں شمار بائیں کونہ پر درج ہے۔

انداز تحریر: کاتب نسخہ محمد بن ابی الجاہ الحضرمی کا قلم نسخ بھی نہیں ہے اور نستعلیق بھی نہیں، یہ نسخ اور مغربی خط کا مجموعہ ہے۔ کاتب حروف کو عموماً ٹیڑھا کر کے لکھتا ہے، تحریر میں یکسانیت نہیں، کہیں قلم جلی ہے، کہیں متوسط، کہیں خفی، یہی حال سطور کا بھی نظر آتا ہے، اس کا کوئی مقررہ اصول نہیں ہے۔ فی صفحہ ۲۳ (مخطوطہ، ورق ۱۷/ب) سے تینتیس سطریں تک آئی ہیں۔ (مخطوطہ ورق ۲۰۷ ب) بعض اور اوراق پر ۲۴/سے ۳۲/سطور ہیں۔ کاتب بعض مرتبہ ایک دوسرے کے مقابل صفحات میں بھی مطابقت کا خیال نہیں رکھتا، جس صفحہ پر جس طرح قلم چل گیا، چل گیا۔

ناقلین کتب اور وراقین کا عام معمول ہے کہ وہ عنوان عبارت کے سرآغاز یا منتخب وممتاز الفاظ اور عبارتوں کو نمایاں کرنے کے لیے سرخ روشنائی سے یا کسی اور رنگ سے لکھتے ہیں، جو پڑھنے والے کی توجہ جذب کر سکے۔ ہدی الساری کے اس نسخہ کے ناقل (محمد بن ابی الجاہ حضرمی) نے بھی اسی معمول کی پابندی کی ہے، مگر حضرمی کے اس عمل میں بھی یکسانیت نہیں، کئی موقعوں پر وہ ابواب، عنوانات، فصلوں اور قولہ وغیرہ سب کو سرخ روشنائی سے روشن کرتا ہے، لیکن تقریباً ایک تہائی کتاب کے بعد اس طریقہ اور سرخ روشنائی کے استعمال میں خاصی کمی آ گئی ہے، کاتب بعد میں بڑے خاص عنوانات کو سرخ روشنائی لکھتا ہے اور جو چیزیں اوسط درجہ کی سمجھتا ہے، ان پر صرف ایک لکیر کھینچ دیتا ہے یا لال نشان لگا دیتا ہے، یہی ترتیب تقریباً آخر کتاب تک چلی گئی ہے۔

کاغذ: نسخہ کا کاغذ بہت عمدہ، چکنا اور ایسا ہے کہ سوا چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی کہیں سے خستہ اور کمزور محسوس نہیں ہوتا۔ آج بھی اس کے صفحات میں چمک، چکناہٹ موجود ہے، مگر کاغذ ایک قسم کا نہیں ہے، دو قسم کا کاغذ ہے، دوسرا کسی قدر ہلکا ہے، مگر زیادہ فرق نہیں ہے۔

حافظ کے قلم سے اپنے سامنے قرأت وسماعات کی متعدد تصدیقات: کم سے کم دو اشخاص شیخ سمیر الدین اور ان کے بیٹے محمد نے حافظ ابن حجر کے سامنے اس نسخہ میں پڑھا ہے۔ دونوں کے پڑھنے سننے کی جگہ جگہ تصدیق کی گئی ہے۔ پہلی تحریر کے الفاظ یہ ہیں:

بلغ سیدنا الشیخ سمیر الدین صاحب ھذہ النسخۃ عرضا وسماعاً، وولدہ محمد علی مؤلفہ فی المجلس الأول۔ کتبہ مؤلفہ عفی اللہ عنہ

(ورق ۔۷۔الف)

اس کے بعد تقریباً آخری کتاب تک بلاغات وسماعات کی تصدیق درج ہے۔

ب: ایک اور موقعہ پر تحریر ہے: بلغ معاملة وسماعا فی الدار؟ (ورق: ۱۲-الف) یعنی یہ سماع اور درس واستفادہ، حافظ ابن حجر کے دولت کدہ پر ہوا ہے۔

ج: ایک حاشیہ پر رقم فرمایا ہے: ثم بلغ صاحبه، اعزه الله تعالیٰ سماعا علی۔ کتبہ مولفه (ورق:؟؟؟)

د: ورق ۴۸/ب، کا اندراج ملاحظہ ہو: ثم بلغ اعزه الله تعالیٰ۔

ہ: ورق ۵۰/الف پر ہے: بلغ مقابلة۔

و: ورق ۵۳/ب پر لکھا ہے: ثم بلغ کذالک۔

ز: ورق ۱۲۱/الف پر ہے: بلغ سماعا وعرضا۔

چند اوراق کے بعد جگہ جگہ لکھا ہے: بلغ کذالک، ثم بلغ کذالک، ثم بلغ کذالک، ثم بلغ کذالک کہیں کہیں صرف بلغ بھی تحریر ہے۔

یہ بلاغات اور تصدیق قرأت وسماعات، ہدی الساری کے اس نسخہ میں رجال کی آخری بحث تک مسلسل درج ہیں، رجال کی بحث میں اور اس کے بعد ان کا اندراج نہیں، اسی طرح رجال کے باب میں اصلاح وترمیم بھی بہت کم کی گئی ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے، دو تین ورقوں کے بعد کوئی مختصر فقرہ لکھا ہے۔

مذکورہ نسخہ میں حافظ ابن حجر کے قلم سے بے شمار تحریریں اور اضافے: اس نسخہ کے حاشیے، توضیحات اور اضافوں سے بھرے ہوئے ہیں، جس میں لفظی ترمیمات بھی ہیں، متن کی درستگی اور تبدیلی بھی کی گئی ہے، کثیر اضافے بھی ہیں اور توضیحات بھی، مگر یہ تمام حاشیے اور اضافے ایک قلم سے ایک انداز میں تحریر نہیں، بلکہ میرے ناقص خیال میں یہ چار طرح کی تحریریں ہیں۔ ایک باریک عمدہ، خوش قلم، نسخ کی تحریر ہے، حضرت مصنف کے دستخط اور توثیقات گواہ ہیں کہ یہ حضرت حافظ ابن حجر کا قلم ہے، ایک اور تحریر جس کی روشنائی کشمشی رنگ میں ذرا پھیلی پھیلی سی ہے، یہ بھی حافظ کی تحریر ہے۔ حافظ کے قلم سے اس کی بھی ضمناً تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ حافظ کی یادگار ہیں، دو تحریریں اور ہیں، ایک نسخ میں جو عمدہ اور خوشنما نہیں، ایک اور تحریر کسی قدر کھلی کھلی سی ہے، اگرچہ مجھے اس کی کوئی

داخلی شہادت نہیں ملی لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ دونوں تحریریں بھی خود حافظ کی ہوں گی، کیونکہ ہدی الساری کی اس نسخہ کے کاتب (محمد بن ابی الجاہ حضرمی) کی طرح حافظ کا قلم بھی یکساں نہیں، حافظ کبھی کسی طرح لکھتے ہیں کبھی کسی اور طرح۔ ہندوستان کے بلند پایہ محقق اور محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے حافظ ابن حجر کی روانی قلم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

و کان سریع الکتابة لیس بجید الخط و لا یحوی فی کتاباته علی خط واحد و یکثر التغییر فی کتاباته حتی تصیر مبیضته مسودة و کذالک اختلفت نسخ مؤلفاته۔ (۴)

اس کے علاوہ حافظ کی تصنیف کے اصل نسخوں، تصانیف ومولفات کا پڑھنا خصوصاً متاخر دور کی بہت مشکل ہے، کئی مرتبہ اس کی تہہ تک پہنچنا دشوار ہوجاتا ہے۔ حافظ ابن حجر کے احوال و تصانیف پر وسیع نظر رکھنے والے محقق ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم کا قول ہے:

و قد لاحظت عند دراستی لمولفاته، ان خطه یقرأ بصعوبة باللغة، ویصعب علی من لم یمارس قراة المخطوطات، ان یقرأ علی وجه الصواب۔ (۵)

حافظ کی معجم اسانید کی خودنوشت یادگار "المعجم المؤسس للمعجم المفہرس" کے مرتب اور حاشیہ نگار نے اس کتاب کی تمہید میں اس المعجم الموسس کے نسخہ مصنف کی تحریر کے متعلق لکھا ہے:

وهذه النسخة یصعب قراء تها، وهی ملیئة بالحواشی و التشطیبات، و الاستدراکات، قد استفدنا منها القلیل۔ (۶)

تقریباً یہی بات شیخ محمد عوامہ نے مقدمہ تقریب التہذیب میں کہی ہے۔ (۷) ان تصریحات سے واضح ہے کہ حافظ ابن حجر کا قلم مختلف رہتا تھا ان کا مبیضہ مسودہ میں تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ یقیناً یہی بات ہدی الساری کے اس نسخہ میں بھی نظر آرہی ہے، اس لیے یہ بات اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اس نسخہ کے اکثر حاشیے (دوتہائی یا اس سے زیادہ) حافظ کے قلم سے ہیں۔ کچھ اور افادات جو بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں، ممکن ہے حافظ کے کسی شاگرد کے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ عمل بھی حافظ ابن حجر کی ہدایت اور اجازت سے ہوا ہو۔

زیر تعارف کے تحریراً و تصحیحاً نسخۂ مولف ہونے کی اور اس میں درج تصحیحات و اضافات کے

بخط حافظ ابن حجر ہونے کی اس سے بھی متواتر تصدیق ہورہی ہے کہ اس نسخہ میں تقریباً سو سے زیادہ مقامات پر متن کی قدیم عبارت پر قلم پھیر دیا گیا ہے، پرانی عبارت کو محو کرکے نئی عبارت لکھی ہے، بہت سے الفاظ وکلمات پر خط کھینچ کر یا نشان لگا کر حاشیہ پر حواشی دیے گئے ہیں، یہ اصلاحات وتغیرات ایسے ہیں کہ مصنف کے علاوہ دوسرا شخص اس کا ارادہ اور خیال بھی نہیں کرسکتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی بڑے عالم یا مصنف کے لکھے ہوئے نسخہ میں، دو چار الفاظ کتابت یا سبقت قلم سے کچھ اور لکھے گئے ہوں، کاتب نسخہ یا ناقل ان کو درست کردے، مگر یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اس میں بار بار کثرت سے ترمیم واصلاح کرکے اس کو علاحدہ کتاب بنانے کی کوشش کرے۔ مصنف نے اس نسخہ میں جو ترمیمات اور اضافے کیے ہیں، وہ کئی طرح کے ہیں۔ ترمیم کی عموماً دو صورتیں ہیں:

اندرون کتاب یا متن میں جو فقرہ یا کلمہ اصلاح طلب محسوس ہوا اس پر قلم پھیر کر گویا کالعدم کردیا۔ اس جگہ پر ہلال کا خفیف سا نشان بنا کر یا حاشیہ پر ترمیم کی گئی عبارت میں نئے فقرے یا کلمات لکھے ہیں۔ یہ ترمیم کبھی متن میں تخفیف کی گئی عبارت کے برابر ہوتی ہے، کبھی کم یا زیادہ۔ کئی موقع پر متن کی عبارت پہ لائن کھینچ کر اس کو کالعدم نہیں کیا گیا، بلکہ اس عبارت پر خفیف سے نشانات لگا دیے، جو اس طرح کے ہیں ـــہ ـــہ ـــ ـ

بعض جگہوں پر عبارت کو قلم زد کرنے یا نکالنے کے لیے اس کے ابتدائی اور آخری حرف پر صرف ''لا'' کا نشان لگا دیا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ مصنف نے نظر ثانی کے وقت اس عبارت کو اپنے مسودہ سے خارج کردیا ہے۔

کچھ موقع پر ترمیم کے لیے کوئی نشان نہیں لگایا گیا، حاشیہ پر کچھ نہیں لکھا، بلکہ اسی جگہ اندرون کتاب میں پرانی عبارت پر قلم سے ایک لکیر کھینچ کر، اسی جگہ نئی عبارت لکھ دی ہے۔ اس قسم کی ترمیمات کی نوعیت جاننے کے لیے ایک عبارت اور اس کی ترمیمات کا یہاں نقل کرنا مفید ہوگا، اس سے حافظ کے بنیادی نسخہ (مسودہ) اور بعد کی اصلاحات وترمیمات کا فرق معلوم ہوگا۔ حافظ نے کتاب التوحید کے تحت ایک موقع پر لکھا ہے:

> حدیث عبداللہ، ھو ابن مسعود، اجتمع عند البیت ثقفیان
>
> وقرشي او قرشیان وثقفي تقدم۔

اس موقع پر حافظ ابن حجر نے لفظ تقدم پر ہلال کا نشان بنا کر حاشیہ پر اس فقرہ کو اس طرح لکھا: في تفسير فصلت

بعد کے نسخوں میں یہ عبارت موجود ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "تقدم في تفسير فصلت" معلوم ہوا کہ ہدی الساری کے ابتدائی نسخہ یا مسودہ کی عبارت تقدم پر ختم ہوگئی تھی، حافظ نے زیر نظر نسخہ کے حاشیہ پر ایک مختصر فقرہ بڑھایا: "في تفسير فصلت" جس سے بات مکمل ہوگئی۔

اس سے ملحق ایک عبارت اور ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"ان الثقفی عبد یا لیل .... بن عمرو بن عمیر .... و صفوان بن امیہ۔ و قتل الثقفی الاخنس بن شریف و الفرس الاسود بن عبدیغوث، و قتل الثقفی حبیب بن عمرو۔ و قد اشرنا الی ذالک في کتاب التفسیر"۔ (۸)

مگر پوری عبارت قلم زد کردی ہے، یعنی مصنف نے اپنے پہلے نسخہ یا مسودہ میں یہی لکھا تھا، نظر ثانی کے وقت اس کو ساقط اور خارج کر دیا، اسی وجہ سے عبارت مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں۔

اسی طرح کی ایک مثال اور جس سے معلوم ہوگا کہ یہ نسخہ مصنف کے نہایت توجہ اور اہتمام سے اصلاح کیا ہوا مکمل نسخہ ہے۔ حافظ نے تحریر فرمایا ہے:

حديث ام عطية: نهينا عن اتباع الجنائز، رواه ابن شاهين باسناد صحيح۔

ابن شاہین پر خفیف سا ہلالی نشان لگا کر حاشیہ میں اس حوالہ کا اضافہ کیا ہے (والاسماعیلی) اب مکمل عبارت اس طرح ہوگئی ہے:

"رواه ابن شاهين و الاسماعيلي باسناد صحيح"۔

یعنی نظر ثانی میں الاسماعیلی زیر نظر فقرہ پر اضافہ کیا گیا ہے، ابتدائی اصل مسودہ میں شامل نہیں تھا، مطبوعہ میں بھی موجود ہے۔ اسی کے بعد ایک اور عبارت پڑھیے، اس میں ترمیم اور اضافہ دونوں عمل ایک ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

"حديث زينب بنت أبي سلمة، لما جاء نعي أبي سفيان من الشام، المعروف: جاء نعي يزيد بن ابی سفيان (فلعله كان فيه نعي ابن ابی سفيان، فسقط ابن)۔

وقد رواه المصنف من طريق اخرىٰ بلفظ: لما توفي اخوها، و هذا هو

الصواب۔

زیر نظر نسخہ بتا رہا ہے کہ مصنف نے بعد میں اس عبارت میں دو طرح سے ترمیم کی ہے: ''أبی سفیان'' پر ہلالی نشان لگا کر حاشیہ پر یہ اضافہ کیا ہے:

''فلعله كان فيه نعني ابن ابی سفیان، فسقط ابن''

اور اس کے بعد کی جو عبارت ہے وقد رواہ المصنف سے آخر تک اس عبارت پر قلم پھیر دیا ہے، یعنی یہ مکمل فقرہ جو ابتدائی مسودہ میں موجود تھا نظر ثانی میں بالکل نکال دیا ہے، اس پر ایک فقرہ فلعله كان سے فسقطت ابن کا اضافہ کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے مطبوعہ نسخہ میں فلعله كان عبارت موجود ہے، بعد کی عبارت غائب ہے۔

تصحیح کا ایک اور طریقہ: اوپر گذر گیا ہے کہ مصنف ہر موقع پر ایک ہی نشان یا علامت کی پابندی نہیں کرتے، ایک مقصد کے لیے ایک سے زائد علامت و اشارے بھی استعمال فرماتے ہیں، جیسے کچھ عبارتوں میں فقروں کو نظر ثانی میں خارج کرتے وقت ان پر قلم نہیں لگایا، لکیر نہیں کھینچی، بلکہ جس فقرہ یا عبارت کو حذف کرنا ہے، اس کے سب سے پہلے اور سب سے آخری حرف پر کلمہ لام الف لا ثبت کر دیا ہے، جو اس کی علامت ہے کہ اس عبارت کو ختم کر دیا ہے، اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی کی ایک مثال یہ ہے کہ:

رجا وعلی بن عاصم عن عبداللہ (بن ابی بکر وقد رواہ مسعر و

مرجأ بن مرجأ وعلی بن عاصم عن عبیداللہ)۔ (۹)

مصنف نے نظر ثانی میں اس کے دو تہائی حصہ کو کالعدم کر دیا، بن ابی بکر سے آخر تک پوری تحریر خارج کی گئی ہے، مگر اس پر خط کھینچ کر واضح نہیں کیا بلکہ پہلے لفظ ابن ابو بکر سے عبیداللہ تک ہر ایک لفظ پر ــہ ــ نشان لگائے ہیں، آخر میں عبیداللہ کے اختتام پر ''لا'' لکھ دیا ہے، یعنی آیندہ کے لیے اس عبارت کو کتاب میں شامل کرنے کی نفی کی جا رہی ہے۔

اضافہ کی ایک اور مثال، سنہ بھی تحریر ہے: ایسے اضافے جو اس نسخہ کے حاشیہ پر کیے، بعض موقع پر کئی کئی سطریں ہیں، ان میں سے زیادہ وہ ہیں جو المنيرية کے نسخہ میں شامل ہیں، مگر یہ بات صرف یہ مخطوطہ ہی یہ واضح کر سکتا ہے کہ کون کون سا افادہ اور حاشیہ حافظ نے اس نسخہ میں بعد کے

دور میں شامل کیا، اس میں چند اضافے بھی ہیں، جو حافظ کی زندگی کے آخری زمانہ کی یادگار رہیں۔ مثلاً مطبوعہ نسخوں میں ایک عبارت عموماً شامل ہے:

قوله ان سائلا سأله، لم أقف علی اسمه، لکن ذکر شمس الدین الحنفی السرخسی، فی کتابه المبسوط۔ ان السائل الثوبان۔ (۱۰)

مخطوطہ میں اس مختصر عبارت کے ساتھ ایک خاص تاریخی اور اہم صراحت ہے۔ لکھا ہے: ''ألحق ۸۴۹ھ''۔

یعنی یہ الفاظ حافظ ابن حجر نے ۸۴۹ھ میں اضافہ کیے تھے جو واضح شہادت ہے کہ ہدی الساری کا یہ نسخہ آخری دور تک حافظ کے سامنے رہا اور اصلاحات وترامیم سے آراستہ ہوتا رہا۔

حافظ ابن حجر کا ایک معمول جس کو خاص احتیاط اور عبارت کو شبہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کہنا چاہیے، یہ بھی ہے کہ حافظ کئی مرتبہ مختصر ترمیم یا ضروری اضافہ، متن میں قدیم تحریر کے ساتھ ہی کر دیتے ہیں اور اگر اس سے مغالطہ کا اندیشہ ہو، تو اس جگہ پر حجر، حجر لکھ کر گویا اپنے دستخط بھی کر دیتے ہیں، اس سے پڑھنے والوں کو یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ یہ غلطی سے لکھا گیا ہوگا یا کسی اور شخص کی تحریر و ترمیم ہے۔ مثلاً (ورق ۱۶۳/ب پر) ایک عبارت ہے: ''رواہ ابن ابی شیبۃ والحاکم''

اس کے حاشیہ پر: واحمد کا اضافہ کیا ہے اور چونکہ اسی سطر کے نیچے دوسری سطر میں بھی، ایک اور تصحیح بھی کی گئی ہے، اس پر خط کھینچ دیا ہے۔ یہ دونوں عبارتیں اسی ترمیم کی وجہ سے آپس میں مل گئی ہیں، اس لیے دونوں پر حجر حجر لکھ دیا ہے کہ اس تصحیح سے قاری کو وہم اور پریشانی نہ ہو۔

ترمیم اور اس پر نظر ثانی: حافظ کی تصحیحات وترمیمات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چند عبارتوں میں حافظ نے دو دو مرتبہ تبدیلی کی ہے، مگر پھر ترمیم شدہ عبارت کو ختم کر کے، وہی عبارت دوبارہ باقی رکھی ہے جو ابتدائی مسودہ میں تھی۔ مثلاً (ورق ۱۹۳، سطر ۷) میں لکھی، متن میں لکھے ہوئے فقرہ کو قلم زد کر کے دوبارہ اسی جگہ پر نئی عبارت تحریر کی گئی، بعد میں اس کو بھی تبدیل کر دیا اور حاشیہ پر ایک نیا فقرہ تحریر کیا، آخر میں دونوں جگہ حافظ نے اسی عبارت کو باقی رکھا جو اصل مسودہ میں ہے۔

اصلاح وترمیم کے چند اور طریقے: مصنف سے انتساب میں کسی کو شبہ نہ ہو، اس لیے حافظ ابن حجر نے اہتمام کیا کہ ہر اضافہ کے اختتام پر اپنا پورا نام ابن حجر یا اس کا اشارہ تحریر فرما دیا۔ یہ معمول

صرف حاشیوں پر نہیں ہے بلکہ کتاب کے متن میں بھی کئی جگہ یہی عمل ہے۔

اسی طرح اگر کہیں کسی عبارت کے درمیان میں یا نئے عنوان اور فصل وغیرہ سے پہلے آدھی سطر یا چند کلمات اور فقروں کی جگہ خالی رہ گئی، وہاں بھی اپنا نام لکھ یا دستخط ثبت کردی، ایسے مقامات پر صرف ایک مرتبہ نہیں، بلکہ بیشتر تین مرتبہ حجر، حجر، حجر لکھتے ہیں کہ یہ بیاض صحیح ہے۔ کئی موقع پر جہاں کاغذ سادہ ہے، صحیح البیاض کی بھی صراحت ہے۔

حواشی پر پرچیوں کا اضافہ (۱۱): اس نسخہ میں کم سے کم چار علاحدہ اوراق پر الگ الگ چھوٹی بڑی پرچیاں چپکی ہوئی ہیں، یہ غالباً وہ افادات ہیں جو بالکل آخری دور میں بڑھائے گئے، ایک چٹ پر سن کتابت بھی تحریر ہے، لکھا ہے: "الحق ۸۴۴ھ" یعنی یہ عبارت یا افادہ ۸۴۴ھ کا ہے، اہمیت وافادیت کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کتاب میں حاشیہ کی گنجائش تھی تو علاحدہ سے یہ چٹیں کیوں لگائی گئیں؟

بین السطور اضافے: مصنف نے ایک دو حرف یا مختصر فقرات والے اضافے، بین السطور میں بھی کیے ہیں، مگر یہ تعداد اور مقدار دونوں میں بہت کم ہیں، جیسے (ورق ۶۰/ب) کی دسویں، گیارہویں سطروں کے درمیان خفیف اضافہ۔

خطی نسخہ کے اضافات ومندرجات، مطبوعہ نسخوں میں موجود ہیں: اس نسخہ کے اور بھی کئی پہلو ہیں، اگرچہ یہاں ان سب کی وضاحت ونشاندہی کا موقع نہیں، تاہم اس نسخہ کی ایک معروف اشاعت (مطبوعہ منیریہ مصر ۱۳۴۷ھ) اور نسخہ میں عبارت کی تقدیم وتاخیر، ابواب کی ترمیم اور الفاظ کا اختلاف واضح ہے اور خطی نسخہ کے چند مندرجات مطبوعہ نسخوں میں شامل ہی نہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حافظ نے مقدمہ کے زیر نظر نسخہ میں کتاب الطہارۃ سے احادیث کا سلسلہ شروع کیا ہے (۱۲)، احادیث کا شمار مسلسل ہے، درمیان میں ابواب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب البیوع وغیرہ کے عنوانات آتے رہتے ہیں، ان کے ذیل میں بہت سی احادیث کی وضاحت ہے کہ یہ حدیث کس کتاب کی ہے، بہت سی احادیث کے آغاز پر ان کتابوں کے ناموں کے مخففات ہیں صحیح بخاری کے لیے خ، صحیح مسلم کے لیے م، سنن نسائی کے لیے س وغیرہ ہیں۔ مثلاً:

کتاب الطہارۃ میں الحدیث الثانی، قال الدار قطنی پر خ اور م کا اشارہ درج ہے۔

اسی طرح الحدیث الثالث، قال الدار قطنی پر بھی خ-م کا اشارہ ہے، الحدیث الرابع

پر کچھ نہیں ہے۔ الحدیث الخامس پر خ-م رقم ہے۔

الحدیث الثالث و الثلثون پر بھی یہی خ-م تحریر ہے۔ مگر ان تمام اشارات میں ایک بھی مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں۔

چند اور ایسے عنوانات و مضامین جو نسخہ مصنف کی ابتدائی ترتیب میں شامل تھے، بعد میں حذف کر دیے گئے

اس نسخہ میں سے ایک خاص تغیر بیسیوں عنوانات کی ترمیم بھی ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں ان کا بھی کچھ تذکرہ ہو جائے۔

ہدی الساری جلد ثانی میں ایک عنوان ہے: من باب حج ابی بکر الی التفسیر مگر خطی نسخہ میں (۱۵۱/الف) من حج ابی بکر الی مرض النبی صلی اللہ علیہ و سلم ہے۔

اس کے بعد ایک اور باب یا عنوان ہے:

"من باب مرض النبی صلی اللہ علیہ و سلم الی کتاب التفسیر" (مخطوطہ ورق ۱۵۱/ب) مگر مصنف نے اس عنوان کو کاٹ دیا، یہ باب بھی مطبوعہ میں موجود نہیں۔ (ص ۵۲، ج ۲) اسی قسم کے اور بھی متعدد ابواب و عنوانات ہیں جن کو مصنف نے نظر ثانی میں، کتاب کی سابقہ ترتیب سے خارج کر دیا ہے یا اس میں ترمیم کی ہے۔ اس کے الفاظ تبدیل کیے ہیں یا ان کو بالکل ہی نکال دیا ہے۔

مخطوطہ اور مطبوعہ میں فرق: مطبوعہ نسخوں میں چند ایسے عنوانات و مندرجات ملتے ہیں، جن کو مصنف نے اپنے نسخہ میں قلم زد کر دیا تھا۔ مثلاً:

من باب القسمۃ و تغلیق القنو فی المسجد الی السترۃ۔

نسخہ سے یہ خارج تھا (ورق ۱۲۶/الف) مگر یہ مطبوعہ میں موجود ہے۔ (دیکھیے: ص ۱۱، ج ۲)

چند جگہوں پر عبارت میں کچھ تقدیم و تاخیر بھی ہو گئی ہے جیسے مخطوطہ (ورق ۱۵۲/الف) میں "من حج ابی بکر رضی اللہ عنہ" کی ابتدا حدیث ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ و کانت منھم، ای من بنی.... تقدم الینا ام سمرۃ فی العتق۔ (مطبوعہ: ۵۱-۲)

اس میں دو باتیں توجہ چاہتی ہیں اول یہ کہ مخطوطہ کی پہلی تحریر میں یہ عبارت مکمل نہیں تھی، حافظ ابن حجر نے اس کو تصحیح یا نظر ثانی میں مکمل کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مخطوطہ میں باب حج ابی

بکر کے بعد، پہلی روایت حضرت ابن عباس کی ہے، مگر مخطوطہ میں باب کی ابتداء مذکورہ بالا روایت سے ہورہی ہے۔ اسی طرح کی اور بھی متعدد روایتیں ہیں، جو آگے پیچھے ہوگئی ہیں یہ جملہ تصحیفات اور سہو تحریر و طباعت ہیں، جو خطی نسخہ کے توجہ سے مطالعہ کے بعد بڑی تعداد میں سامنے آتی ہیں، مگر نمونہ کے لیے یہی بہت ہے۔

نسخہ کا سب سے پہلا ورق: نسخۂ کاندھلہ میں ایک کمی یہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا صفحہ یا سرورق محفوظ نہیں رہا۔ پہلا صفحہ یا ورق اگر محفوظ رہتا، تو اس سے اس زیر تعارف نسخہ کے تمام گوشے واضح ہوجاتے۔ ممکن تھا کہ اس پر حافظ ابن حجر کے قلم سے، اجازت یا کوئی اور وضاحتی تحریر درج ہوتی، خیال ہے کہ اس وقت جو پہلا صفحہ اس نسخہ کے ساتھ شامل ہے، وہ غالباً دسویں صدی ہجری میں نقل کرکے اصل نسخہ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ صفحہ کس نے لکھا اور اس نسخہ میں شامل کیا اس کا علم نہیں، لیکن اس کے پہلے صفحہ پر اسی کاتب کے قلم سے (جس نے اس ضائع صفحہ کو نقل اور مکمل کیا ہے) تحریر ہے:

مقدمة شرح البخاری للإمام العلامة حافظ العصر قاضی القضاة شهاب الدين احمد بن علی ابن حجر العسقلانی الشافعی رحمه الله تعالیٰ۔

یہ تحریر عربی اسلوب میں ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا شاید کوئی عرب ہوگا۔

نسخہ کے سرورق اور صفحہ پر درج تحریریں، مہریں: سرورق کی اس عبارت کے نیچے سب سے پہلے ایک گول مہر ہے، جو مٹی ہوئی ہے، اس کے چند الفاظ واضح نہیں ہیں، مہر کی آخری سطر میں "محمد" اور اوپر بائیں جانب "اللہ" پڑھا جاتا ہے۔ ایک حرف جو اوپر کی سطر کا پہلا حرف ہے، صاف نہیں ہے، یہ ولی اللہ، ثناء اللہ، وفاء اللہ یا اسی طرح کا ملتا ہوا کوئی نام ہے، جو پڑھنے میں نہیں آیا۔ اس تحریر کے بعد اس سے ملا ہوا ایک نشان سا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ مہر تھی، جس کو بالکل مٹا دیا گیا یا لغزش قلم سے لگا ہوا روشنائی کا نشان ہے۔

اس صفحہ کے اوپر دائیں کونہ پر قدیم فارسی الاصل ہندوستانی اعداد میں اوراق کی تعداد درج کی گئی ہے، اعداد میں لکھا ہے دوسواڑتیس ورق، اس کے نیچے اس نسخہ کی قیمت سات روپیہ لکھی ہوئی ہے۔

نسخہ پر درج مغلیہ عہد کے ایک بڑے امیر کی تحریر اور مہر: اس کے اختتام پر بائیں کونہ سے ایک آڑی تحریر ہے جو پھیلتی، چوڑی ہوتی ہوئی دائیں جانب مڑتی ہوئی اس صفحہ کے وسط تک آگئی ہے، یہ کسی

قدر جلی قلم سے ہے۔اس سے (ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں) اس نسخہ کی تاریخی اہمیت کا پتہ چل رہا ہے، اس کی بہت عمدہ، پختہ نستعلیق تحریر ہے، اس کے الفاظ اور سطور اصل کے مطابق اس طرح ہیں:

مقدمہ شرح بخاری

قیمت (دس روپئے)

وقفت فی سبیل اللہ فرزند بجان پیوند

ہدایت اللہ خاں را، معہ فرزندان

متولی نمود ۲۳ محمد شاہی لطف اللہ خاں (۱۳)

ذی قعدہ ۱۷ بہادر۔ صادق ۱۱۲۲ھ

ترجمہ: میں نے اس کتاب کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور اپنے جان سے پیارے بیٹے ہدایت اللہ خاں کو اور بیٹوں کے ساتھ، اس کا متولی بنا دیا ہے۔

اس عبارت کے بیچ میں ''لطف اللہ خاں صادق بہادر'' کی مہر ثبت ہے۔اس کی دائیں جانب ''رجب ۳، احمد شاہی'' لکھا ہے اور اس کے نیچے دائیں طرف تحریر ہے: ''عرض دیدہ شد'' یعنی یہ کتاب ملاحظہ شاہ سے گزر چکی ہے۔

ایک اور مہر فضلی علی کی: اس کے نیچے ایک اور چھوٹی سی بیضوی مہر ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: بندۂ ال عبا، ۱۱۸۴ فضلعلے۔فضل علی کو ملا کر لکھا ہے، کذا: فضلعلے۔یہ مہر غالباً فضل علی عثمانی پانی پتی کی ہے، جو شاید شاہ عبدالعزیز کے متوسلین میں سے تھے۔ان کے کتب خانہ کی دس بارہ قلمی کتابیں جن پر فضل علی یا ان کے فرزند محمد یٰسین پانی پتی کی مہریں اور دستخط ہیں، ہمارے قلمی ذخیرہ میں موجود ہیں۔ایک کتاب ایسی بھی ہے جو خود، فضل علی پانی پتی نے مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کو پیش کی تھی۔فضل علی کے قلم سے اس پر ہدیہ وغیرہ کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔یہ تحریر ۱۲۰۰ھ کی ہے۔اس لیے یہ خیال بے وجہ نہیں کہ ہدی الساری کا یہ نسخہ شیخ فضل علی پانی پتی نے اور کتابوں کے ساتھ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (وفات ۱۲۴۵ھ-۱۸۲۹ء) کی نذر کیا ہوگا۔البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فضل علی ان کے علاوہ کوئی اور شخص ہوں۔

''عرض دیدہ شد'' یہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں (جنھوں نے ہندوستان پر تقریباً ساڑھے تین سو سال ۹۳۲ھ-۱۵۲۶ء سے ۱۲۷۴ھ-۱۸۵۷ء تک حکومت کی) کے علمی مزاج اور کتب خانہ

رکھنے کے ذوق کی خاص یادگار اور پہچان ہے۔

بادشاہوں کے کتب خانے اور خود کتابوں سے دلچسپی: دستور یہ تھا کہ شاہی کتب خانہ میں جو کتابیں داخل ہوتی تھیں وہ بادشاہ وقت کے ملاحظہ سے گزاری جاتی تھیں یا جب سال میں عموماً ایک مرتبہ شاہی کتب خانہ کی مکمل صفائی، ترتیب کتب اور فہرست کتب سے موجودہ کتابوں کی مطابقت کی جاتی تھی تھی، اس وقت بادشاہ جس کتاب کو بذات خود دیکھتا، ملاحظہ کرتا، اس پر ''عرض دیدہ شد'' کے الفاظ اور اس کے نیچے ملاحظہ کی تاریخ لکھ دی جاتی تھی۔ بعض مرتبہ کتب خانہ کے ذمہ دار (کتاب دار) کے دستخط یا مہر بھی اس پر ثبت ہوتی تھی اور کبھی صرف ''عرض دیدہ شد'' کے ساتھ تاریخ ملاحظہ شاہی لکھ دی جاتی تھی۔

سنہ جلوس، ہجری اور عیسوی سنین کے علاوہ ہیں: ایسی کتابوں پر جو یہ سنین درج کیے جاتے تھے، یہ نہ ہجری سنہ تھے نہ عیسوی، نہ کسی اور کلینڈر کی پہچان، بلکہ یہ علاحدہ علاحدہ سنہ ہوتے تھے، جو ہر مغل بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخ اور مہینہ سے شروع ہوتے تھے اور اس بادشاہ کی موت یا تخت سے معزولی پر ختم ہوجاتے تھے، جو نیا بادشاہ تخت پر بیٹھتا، اس کا سن جلوس الگ ہوتا تھا۔

ہندوستان میں مغلوں کے دور حکومت میں ایک ضابطہ اور رواج یہ تھا کہ تمام اندراجات دستاویزات، کتابوں اور خطوط وغیرہ پر، اسی بادشاہ کے سنہ جلوس کے اندراج کو تمام مملکت میں اہمیت اور اولیت دی جاتی تھی، بادشاہ کے تخت پر جلوس کی تاریخ سے ہی تمام حسابات واندراجات ہوتے تھے، ان میں دو بادشاہوں کا زمانہ حکومت ۵۰، ۵۱ سال رہا اور بعض کا چند سال، چند مہینے یا چند ہفتے، مگر ہر ایک کے تاریخ اور سنین کا ایک اصول تھا، اس کے بادشاہ ہونے کے وقت سے تمام سرکاری کاغذات ودستاویزات خصوصاً قاضیوں کے فیصلوں اور سرکاری خط وکتابت میں اسی سن جلوس کا اندراج کیا جاتا تھا۔

مغلوں کے سن جلوس کی سن ہجری سے مطابقت: ان حسابات کی ترتیب پر ۹/رجب ۳ احمد شاہی جو اس مہر کے ساتھ درج ہے، مطابق ہے رجب ۱۱۶۴ھ کے اور ۲۳/ذی قعدہ ۱۷ محمد شاہی مطابق ہوگا، ۲۳/ذی قعدہ ۱۱۴۸ھ (اپریل ۱۷۳۶ء) کے۔ اس نسخہ پر ثبت لطف اللہ صادق کی تحریر میں ۲۳/ذی قعدہ ۱۷ احمد شاہی کی تاریخ، ذی قعدہ ۱۱۴۸ھ کی وضاحت اور اس کے سولہ سال بعد ۱۱۶۴ھ میں شاہی کتب خانہ کا اندراج کہہ رہا ہے کہ یہ نسخہ لطف اللہ صادق پانی پتی کی ملکیت تھا، جس کو انہوں نے فی سبیل اللہ وقف کردیا تھا، مگر یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں داخل کرلیا گیا تھا۔ (۱۴)

مغل بادشاہوں کا کتب خانے ضبط کرنے کا معمول: مغل بادشاہوں کا یہ بھی ایک طریقہ تھا کہ جب وہ اپنے بعض امراء سے ناراض ہوتے تھے، تو ان کی وفات یا معزولی کے بعد ان کے کتب خانے ضبط کر کے شاہی کتب خانہ میں شامل کرلیا کرتے تھے۔ لطف اللہ صادق کے کتب خانہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ لطف اللہ صادق معتوب ہو گئے تھے، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کا گھر بار ضبط کرلیا گیا تھا، غالباً اسی وقت ان کا کتب خانہ یا اس کی منتخب کتابیں دہلی کے لال قلعہ یا شاہی کتب خانہ میں منتقل ہوگئی ہوں گی، جس میں ہدی الساری کا یہ نسخہ بھی رہا ہوگا۔

لطف اللہ صادق کا تعارف: نواب لطف اللہ صادق کا، ہندوستان کے مشہور اور بہت پرانے شہر پانی پت (صوبہ ہریانہ) کے انصاری خاندان سے رشتہ تھا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول کے دور حکومت (۱۱۱۸ھ۔ ۱۷۰۷ء۔ ۱۱۲۴ھ۔ ۱۷۱۲ء) میں شاہی دربار میں آنا جانا ہوا، ترقی کرتے ہوئے بہت اونچے منصب تک پہنچے۔ لطف اللہ صادق کا احمد شاہ (۱۱۶۱ھ۔ ۱۷۴۸ء/ ۱۱۶۷ھ۔ ۱۷۵۴ء) کے زمانۂ حکومت میں انتقال ہوا۔ (۱۵)

فضل علی کون تھے؟: اس کے بعد کی مہر فضل علی کی ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰-۷۱ء) کی ہے، یہ بظاہر شاہی کتب خانہ کے ناظم (کتاب دار) تھے۔ اس کے بعد ہدی الساری کا یہ نسخہ ہمارے جد مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (ولادت ۱۱۶۲ھ۔ ۱۷۴۸-۴۹ء۔ وفات ۱۲۴۵ھ۔ ۱۸۲۹ء) کی ملکیت میں آیا، ان کا علمی ورثہ جو ایک معتبر وموقر کتب خانہ تھا، ان کے اخلاف سے منتقل ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا اور اس وقت ہماری لائبریری کے لیے وجہ افتخار ہے۔

مفتی الٰہی بخش کا تعارف: ہندوستان کا ایک ممتاز ومعزز اور نہایت مشہور دینی علمی خاندان وہ ہے، جس کا کئی سو سال سے قصبہ کاندھلہ ضلع شاملی، مظفر نگر یوپی ہند میں قیام ہے۔ یہ خاندان اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے گھرانہ سے وابستہ، ابوجعفر محمد واعظ بغدادی کی اولاد میں ہے۔ اس گھرانہ کے ممتاز عالم قاضی ضیاء الدین سنامی، ہندوستان کی آٹھویں صدی ہجری کی نامور اور ممتاز دینی شخصیت اور احتساب پر بہت مشہور ومعتبر اہم کتاب نصاب الاحتساب کے مصنف تھے۔ قاضی ضیاء الدین کے پرپوتے قاضی شیخ محمد رجب ۷۹۲ھ (۱۲۹۳ء) میں کاندھلہ اور نواح کے قاضی اور امام مقرر کیے گئے۔ اس وقت ہندوستان کے حکمراں سلطان محمد بن فیروز شاہ تغلق نے اس کے لیے شاہی فرمان جاری کیا تھا،

اس وقت سے یہ خاندان کاندھلہ میں آباد ہے اور نسلاً بعد نسلٍ، دینی علمی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے اس میں آج بھی علماء اور خادمان علم ودین موجود ہیں۔

ابتدائی تعلیم: مولانا مفتی الٰہی بخش بن مولانا محمد عرف حکیم شیخ الاسلام ۱۱۶۲ھ (۴۔۱۷۴۷ء) میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کیا، فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور چودہ سال کی عمر میں (تقریباً ۱۱۷۶ھ، ۱۷۶۲ء میں) دہلی کے مرکز علم میں حجۃ الانام الامام شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم الدہلوی (صاحب حجۃ اللہ البالغہ) کے مدرسہ میں پڑھنے اور تعلیم کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے لیے آگئے تھے۔ خیال ہے کہ اس وقت شاہ ولی اللہ بحیات تھے، مگر مفتی الٰہی بخش صاحب کم سن تھے، ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے، اس لیے شاہ ولی اللہ کو دیکھا ہوگا، ان کی مجالس علم میں حاضر ہوئے ہوں گے مگر شاہ ولی اللہ سے تلمذ اور تعلیم نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے اول شاگرد: شاہ ولی اللہ کے فرزند اور علم وکمالات کے سب سے بڑے وارث شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹ھ۔۱۲۳۹ھ) تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد جب والد کی مسند درس سنبھالی تو اس وقت پانچ طالب علم تعلیم واستفادہ کے لیے شاہ عبدالعزیز کے سامنے حاضر ہوئے تھے، یہ شاہ عبدالعزیز کے سب سے پہلے باقاعدہ شاگرد تھے، ان میں شاہ عبدالعزیز کے دو بھائی (شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر) اور مفتی الٰہی بخش شامل تھے۔ مفتی صاحب نے متوسطات سے اعلیٰ ترین کتابیں، طب اور معقولات کی اعلیٰ ترین درسیات شاہ عبدالعزیز سے پڑھیں۔ اکثر کتابوں میں شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی اور شاہ ولی اللہ کے ایک اور بیٹے شاہ رفیع الدین مفتی الٰہی بخش کے رفیق وہم سبق تھے۔ شاہ عبدالعزیز جن سے بلا مبالغہ ہزاروں علماء نے پڑھا اور اجازات لیں۔ مفتی الٰہی بخش کو اپنے سب سے ممتاز شاگردوں میں شمار فرماتے تھے۔ (۱۶)

مفتی صاحب تعلیم کے بعد شاہ صاحب کے نمایندہ اور قائم مقام کی حیثیت سے نواب ضابطہ خاں کی ریاست میں مفتی اعظم مقرر کیے گئے۔ ضابطہ خاں کی حکومت ختم ہونے کے بعد بھوپال وغیرہ ریاستوں میں ملازم رہے، ہر جگہ علم ودرس، تصنیف وتالیف اور اصلاح وتربیت کا کام جاری رکھا، آخر میں وطن آگئے تھے، یہاں بھی وفات تک علمی خدمات میں ہمہ تن مشغول رہے۔

مفتی الٰہی بخش کی خدمات اور تصانیف: درس وتعلیم، فتاویٰ نویسی، اصلاح وتربیت اور مواعظ

وغیرہ کی مصروفیات کے علاوہ تصنیف وتالیف اور شعر وادب میں بھی اعلیٰ درجہ انہماک تھا، ہندوستان کے علمی حلقوں میں معمول ومروج، تینوں زبانوں اردو، فارسی، عربی ہر ایک میں لکھتے اور شعر کہتے تھے۔ تقریباً چالیس تصانیف، شرحیں اور حاشیے عربی میں، ساٹھ سے زائد فارسی میں اور دس اردو میں ہیں۔ مفتی صاحب کی تحریروں اور معاصر اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی تصانیف ومولفات تھیں، جن کا ہمیں سراغ نہیں ملا۔(۱۷)

عربی تصانیف میں سے **احوال رواۃ صحیح بخاری، فتوح الاوراد شرح حصن حصین، اربعینات فی الحدیث،** (چھ مجموعہ جو مختلف ترتیبات پر مرتب ہیں) **تذکار اصحاب البدر، حدالبصائر فی عد الکبائر، تلخیص غایۃ السول في خصائص الرسول** ﷺ [**تالیف علامہ ابن الملقن**] **شیم الحبیب** [**فی سیرۃ النبی** ﷺ] **امثال العرب، حاشیہ مقامات حریری، احوال علمائے حنفیہ، تلخیص الصواعق في رد الروافض اور شرح قصیدہ بانت سعاد** عربی تصانیف میں شامل ہیں۔

مفتی صاحب کو عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، مفتی صاحب نے شرح بانت سعاد کو اپنی قابلیت اور علوم وفنون میں مہارت کا بہترین نمونہ بنا دیا۔ مفتی صاحب نے قصیدہ بانت سعاد کی عربی میں عمدہ جامع شرح لکھی ہے، بانت سعاد کے ہر ایک شعر کا فارسی، اردو اور عربی میں منظوم ترجمہ کیا ہے، عربی میں حضرت کعب بن زہیرؓ کے خیال کو اسی پیرایہ میں بالکل نئے اور خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ مفتی صاحب کے کمال علمی کا خاص ترجمان ہے، ہندوستان میں ایک مرتبہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

مفتی صاحب نے تقریباً ساٹھ سال تک درس وافادہ کا وسیع سلسلہ جاری رکھا۔ مفتی صاحب کے دامن سے تربیت نکلے فاضل طلبہ اور جید علماء کا ایک بہت بڑا اثر اور فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس پورے خطہ کو علم کی دولت، دین ودیانت اور علوم اسلامیہ کی تعلیم وتدریس سے مالا مال کر دیا۔ بعد کے دور میں خصوصاً شمالی ہندوستان میں، جو نامور علماء اور خادمان دین وشریعت اٹھے اور عالم اسلام کے افق پر چھا گئے، انہوں نے ایسے غیر معمولی دینی ادارے قائم کیے، جو ہندو پاکستان بلکہ پوری دنیا میں علم و خدمت دین کا نشان بنے ہوئے ہیں، پوری دنیا ان سے فیض یاب، منور ومستفید ہو رہی ہے، وہ بلاشبہ

مفتی صاحب کی علمی جدوجہد اوران کے شاگردوں کی جلائی ہوئی علمی مشعلوں سے منور ہوئے اوران کے اثرات سے ایک عالم روشن ہے۔(۱۸)

مفتی صاحب نے متحرک اورصاحب کمال شاگردوں کی ایک طاقتور جماعت یادگار چھوڑی تھی، جس سے اس علاقہ کی دینی تعمیر وترقی، رفعت پرواز اور عالمی نفوذ میں غیر معمولی اورسب سے اہم، سب سے بڑا اورنہایت بنیادی حصہ ہے۔ مفتی صاحب کی تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں، ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ (۱۳/ دسمبر ۱۸۲۹ء) کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ وہیں دفن کیے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ہدی الساری کے آغاز پر جوفہرست مضامین ہے وہ مفتی صاحب کے قلم سے ہے، مفتی الٰہی بخش راقم سطور کے اجداد میں تھے، مفتی صاحب کے کتب خانہ کی اور بہت سی نادر قیمتی قلمی کتابیں، جس میں ہدی الساری کا یہ نسخہ بھی ہے، موجودہ نسل تک پہنچا اور منتقل ہوا ہے۔

کلمۂ اختتام: یہ اس نسخہ کے مندرجات اور بعض مشتملات کا سرسری اور جزوی تعارف ہے، اس کے کاتب کے سوادتحریر، اس کی فروگذاشتوں، مصنف (حافظ ابن حجر) کی اس نسخہ پر خاص توجہ، اس میں پڑھانے، اس نسخہ کا اپنے نسخہ سے مقابلہ کرنے، اس نسخہ کی تصحیح فرمانے، اس پر بے شمار تصحیحات اورتعلیقات کا اضافہ فرمانے، کتاب کے آغاز سے اختتام تک اس میں ترمیم واضافہ وقطع وبرید کرنے، اپنے علوم اورافادات ونکات سے اس کو مالا مال بنانے اور بھرپور فرمادینے کی برسہابرس طویل کوشش نے اس نسخہ کوعلوم اورحافظ کے لعل وگہر کا ذخیرہ اورگنجینہ بنادیا ہے۔ ان تمام مندرجات اوراس کے جملہ مشتملات کا حق ہے کہ اس نسخہ کواصل وبنیاد بنا کراور ہدی الساری کے اہم ترین خطی نسخوں کوسامنے رکھ کر، اس طرح مرتب کیا جائے کہ قدیم اور غالباً اہم ترین نسخہ کے تمام مندرجات اوراس میں موجود حافظ کے تمام اضافے، تصحیحات، تغیرات اور جملہ افادات وکلمات محقق اورمنقح ہوکر سامنے آجائیں، دیگر نسخوں سے اس کو مزید بہتر اور بلند سے بلند تر بنانے کی کوشش کی جائے۔ **والحمد للہ علی الاتمام والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خیر الانام، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔**

حواشی

(۱) تصحیح اورتحقیق متن۔ پروفیسر نذیر احمد۔ (علی گڈھ) ص ۲۹۔۲۸، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی، ۱۹۸۸ء۔ (۲) مدرسہ ناصریہ، قاہرہ ۷۰۶ھ میں سلطان ناصر صلاح الدین نے یوسف بن محمد بن سلطان ظاہر نے تعمیر کرایا تھا۔ بعض معلومات کے لیے دیکھیے:

الدارس فی تاریخ المدارس تالیف علامہ عبدالقادر بن محمد النعیمی (م۹۷۸ھ) ص ۸۵۔ ۹۰، ج۱، دارالکتب العلمیۃ، (بیروت ۱۴۲۰ھ۔ ۲۰۰۰ء)۔(۳) بریکٹ میں درج فقرہ، اس تحریر پر اضافہ ہے جو کسی متاخر شخص کی تحریر معلوم ہوتی ہے، اس کی تحقیق آیندہ صفحات میں آ رہی ہے۔(۴)۔مقدمہ، المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ، لابن حجر تحقیق الاعظمی، ص ن، ج۱ (وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ، کویت، بلاسنہ)۔(۵) ابن حجر العسقلانی، مصنفاتہ و دراسۃ فی منھجہ و موارده فی کتابہ الاصابہ ص ۱۸۷، ج۱۔(۶) مقدمہ المعجم المؤسس، لمحمد شکور امریر، المیادینی، ص ۹، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۴۱۷ھ)۔(۷) مقدمہ تقریب التہذیب، تحقیق شیخ محمد عوامہ، ص ۲۰، (طبع دیوبند، الہند)۔(۸) ہدی الساری، مخطوطہ ۸۲۰ھ۔ ورق ۱۶۰۔الف، مطبوعہ منیریہ مصر، ص ۸۰، ج۲ (مصر ۱۳۴۸ھ)۔(۹) ہدی الساری ورق ۱۷۳/الف، الحدیث العاشر من کتاب الصلوۃ مطبوعہ منیریہ مصر، ص ۸۷، ج۲۔(۱۰) مخطوطہ ورق ۱۲۵/الف، مطبوعہ منیریہ ص ۹، ج۲۔(۱۱) ملاحظہ ہو: ورق ۶۵/الف، ورق ۶۷/الف، ورق ۶۷/ب، ورق ۷۱/الف۔(۱۲) ہدی الساری، مخطوطہ از ورق ۱۷۰/ب تا۔(۱۳) لطف اللہ صادق کی ایک اور مملوکہ کتاب پر بھی ایسی ہی عبارت درج ہے لکھا ہے: ''......مع فرزندان متولی نمود'' ۲۲/ذی قعدہ ۱۷ سنہ محمد شاہی۔مگر اس عبارت کا ایک فقرہ، فوٹو میں سیاہ پڑ گیا ہے، اس لیے پڑھا نہیں گیا، اس مخطوطہ پر جو مہر ثبت ہے، اس میں کچھ اضافہ بھی ہے جو اس طرح ہے: ''لطف خاں بہادر صادق، فدوی محمد فرخ سیرُ بادشاہ غازی'' یہ گول مہر ہے، یہ کتاب محدث ابن الجزری کی تصنیف ہے، اس کا عکس خدا بخش لائبریری جرنل کے خاص شمارہ ''ترقیمے، مہریں اور عرض دیدے'' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) کے ص ۲۶۲ پر چھپا ہے۔مگر خدا بخش جرنل کے اس شمارہ میں یہ صراحت نہیں کہ یہ نسخہ کس کتاب کا ہے اور کہاں ہے۔(۱۴) ۱۱۳۱ھ۔ ۱۷۱۹ء سے ۱۱۶۱ھ۔ ۱۷۴۸ء تک محمد شاہ تخت نشین تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ ۱۱۶۱ھ۔ ۱۷۴۸ء میں بادشاہ بنا، ۱۱۶۷ھ۔ ۱۷۵۴ء تک بادشاہ رہا، پہلے کا سنہ محمد شاہی، دوسرے کا احمد شاہی ہے۔(۱۵) مآثر الامراء تالیف صمصام الدولہ شاہنواز خاں، ص ۱۷۷-۱۸۷، فارسی (کلکتہ، ج ۳، حصہ ۳، ۱۸۹۰ء) اردو ترجمہ ایوب قادری ص ۱۵۲، ج۳ (لاہور ۱۹۷۰ء)۔تاریخ پانی پت ص ۲۸-۲۹، شمارہ خاص، ماہ نامہ ''حیات نو'' پانی پت (ج۲، شمارہ۱، جولائی ۱۹۳۶ء)۔(۱۶) ملفوظات فارسی، حضرت شاہ عبدالعزیز-مرتبہ ومولفہ ۱۲۳۳ھ ص ۴۰، (مطبع مجتبائی، میرٹھ، طبع اول ۱۳۱۴ھ)۔(۱۷) مفتی صاحب کی معلومات کے لیے دیکھیے: حدیقۃ الافراح، لاراحۃ الافراح، احمد بن محمد یمانی الشروانی، ص ۲۲۴ (کلکتہ ۱۲۲۹ء)، نزھۃ الخواطر (الاعلام بما فی الھند من الاعلام) مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی، ص ۲۷، ج ۷ (دائرۃ المعارف، ۱۳۹۹ھ۔ ۱۹۷۹ء، حیدرآباد)، تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی اردو، تالیف نورالحسن راشد کاندھلوی (طبع اول کاندھلہ، ۱۴۲۲ھ۔ ۲۰۰۱ء)، (طبع دوم، ۱۴۳۶ھ۔ ۲۰۱۴ء)۔(۱۸) یہ کتب خانہ اگر محفوظ رہتا تو بلاشبہ ہندوستان کے بڑے علمی ذخیروں میں شمار ہوتا، مگر افسوس کہ اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، اس میں حضرت امام غزالی، امام ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ سیوطی اور ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، اور خود ان ائمہ اعلام کے قلم سے لکھی ہوئی متعدد کتابیں موجود تھیں، مگر آہستہ آہستہ اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، مگر بحمد للہ تعالیٰ پھر بھی بہت کچھ باقی ہے۔تقریباً چالیس سال کی محنت و تلاش اور لاکھوں کے خرچ کے بعد تقریباً سترہ سو مخطوطات اندازاً اٹھارہ ہزار مطبوعات اور مشاہیر علمائے ہند کی بے شمار تحریرات و باقیات پر مشتمل ہے۔فالحمد للہ و الشکر علی ھذہ النعمۃ الجلیلۃ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔

کلیدی خطبہ
معارف صدی سیمینار
دارالمصنّفین ۲۰ تا ۲۱ مارچ ۲۰۱۷ء

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

الحمد للہ رب العالمین و الصلٰوۃ و السلام علی رسولہ الکریم و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین۔

صدر مجلس ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب، ناظم دارالمصنّفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب اور معزز حاضرین!

سنہ ۱۹۱۴ء میں شہر اعظم گڑھ کے اسی قطعہ زمین پر جہاں آپ تشریف فرما ہیں، ایک عظیم الشان اور انوکھا واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس کی کوئی نظیر پورے عالم اسلام میں اس وقت تھی نہ اب ہے۔ یعنی ایک ایسے تصنیفی ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی جس کی تمام علمی اور اشاعتی ضرورتیں خود اس کے احاطے کے اندر موجود ہوں، اس کا اپنا پریس ہو، ایک وسیع کتب خانہ ہو، رفقا کی قیام گاہیں ہوں، ان کے لیے وظیفے مقرر ہوں، اور ایک خالص علمی فضا ہو جس میں وہ مکمل ذہنی یکسوئی اور جمعیت خاطر کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام انجام دے سکیں۔ اور جیسے ہی بعض ناگزیر انتظامات مکمل ہوئے، معارف کے نام سے ایک علمی ماہنامہ بھی جاری کر دیا گیا۔

دارالمصنّفین جن حالات میں قائم ہوا، ان سے آپ واقف ہیں۔ اور جس شان سے اس نے ملک و ملت اور علم و ادب کی خدمت کی، اور مسلمانوں کی علمی اور فکری زندگی میں جو عظیم انقلاب برپا کیا، اس کا ایک زمانہ شاہد اور معترف ہے۔ دارالمصنّفین نے ایک صدی کا سفر مکمل کیا تو اس کے بانی علامہ شبلی

ریاض، سعودی عرب۔

کی وفات پر بھی سوسال گزرے۔اس موقع پر دارالمصنّفین نے ایک باوقاراور شایانِ شان تقریب منعقد کی جو بجائے خود یادگار تھی، لیکن صدی مطبوعات کی صورت میں جو بیش قیمت اور دیدہ زیب علمی تحائف اس موقع پر نذر کیے گئے اور بانی دارالمصنّفین کے علمی،ادبی اور قومی کارناموں کو جس طرح یاد کیا گیا،اس نے اپنے محسنوں کی قدردانی اوراحسان شناسی کی ایک قابل تقلید روایت قائم کی جو ایک مدت تک یادگار رہے گی۔

تقسیم ہند کے بعد مسلمانانِ ہند پر کیسی قیامت ٹوٹی!اردو زبان پر تو وہ پیغمبری وقت آیا کہ اپنے ہی وطن میں غریب الدیار قرار پائی!مسلمان ریاستیں ایک ایک کرکے ختم ہوئیں۔دارالمصنّفین شدید بحران سے دوچار ہوا۔حالات ایسے ہمت شکن اور صبر آزما تھے کہ دارالمصنّفین کے وجود کے ساتھ معارف کی بقا بھی خطرے میں تھی۔لیکن جس خدائے کارساز و مسبب الاسباب پر بھروسا کرکے محض اس کے دین کی خدمت کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا،اس کا فضل وکرم شامل حال رہا،اور ہزارہا مشکلات کے باوجود وہ پورے استقلال کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہا جو روزاول سے اس کے لیے متعین کی گئی تھی۔دارالمصنّفین کے بنیاد گزار اور ایثار پیشہ رفقا جو مشعل ہاتھ میں لے کر چلے تھے،اسے ہر حال میں انھوں نے فروزاں رکھا۔تیز وتند ہواؤں کی وجہ سے اس کی لو کبھی دھیمی تو ہوئی لیکن ان جاں نثاروں نے اسے بجھنے نہیں دیا۔علامہ شبلی کے بعد ان کے تلامذہ اور دارالمصنّفین کے ان خدمت گزاروں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے گذشتہ سال ایک علاحدہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔اور اب یہ تیسری بزم سجائی گئی ہے کہ دارالمصنّفین کے ترجمان ماہنامہ معارف نے اردو مجلّات و رسائل کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔برصغیر کیا پورے عالم اسلام میں شاید ہی کوئی ایسا علمی و تحقیقی مجلہ ہو جو سوسال تک بلا انقطاع علم و ادب کے افق پر طلوع ہوتا رہا ہو اور اس کے ناظرین ہر ماہ ہلال عید کی طرح اس کا انتظار اور استقبال کرتے رہے ہوں۔

حضرات! معارف اعظم گڑھ نے علمی دنیا میں ایسی دھوم مچائی کہ اب ہم میں سے کتنوں کو یاد بھی نہ ہوگا کہ اس سے قبل کوئی اور رسالہ بھی اس نام سے نکلتا تھا۔ترکی کے سفر میں علامہ شبلی کی نظر سے وہاں کے جو بلند پایہ علمی رسائل گزرے،ان میں ایک ''معارف'' بھی تھا۔یہ ترکی کا مشہور رسالہ تھا اور ہفت روزہ تھا۔اس میں علوم جدیدہ پر اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہوتے تھے۔علامہ شبلی کو یہ

نام ایسا بھایا کہ ترکی سے واپسی کے دوسرے ہی سال ۱۸۹۳ء میں انہوں نے اسی نام سے ایک رسالے کا خاکہ شائع کیا اور غالباً امتیاز کے لیے اس پر لام تعریف داخل کر دیا، یعنی اس کا نام "المعارف" رکھا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین سے وابستگی کی وجہ سے وہ تو یہ رسالہ نکال نہ سکے، البتہ اسی دوران مولانا وحید الدین سلیم نے ۱۸۹۸ء میں معارف کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا جو پہلے علی گڑھ پھر پانی پت سے تین چار سال تک نکلتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلیؒ نے جب ماہنامہ الندوہ کی تجویز پیش کی تو اسے بند ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ہوسکتا ہے اسی بنا پر انہوں نے الندوہ کا نام معارف نہیں رکھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رسالہ تحریک ندوۃ العلماء کا ترجمان تھا، اس لیے اس کا نام "الندوہ" تجویز کیا گیا۔ بہرصورت مشیت الٰہی نے یہ نام دارالمصنّفین کے اس ترجمان کے لیے محفوظ رکھا جسے ایک دن معارف سے دائرۃ المعارف بننا تھا، چنانچہ دارالمصنّفین سے قدیم وجدید علوم کا یہ مخزن جب نکلا تو دنیا نے دیکھا کہ معارف کا نام اپنی وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس کی قامت زیبا پر کیسا راست آرہا تھا!

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

معارف سنہ ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا، لیکن عالم غیب میں اس کی تیاریاں ایک مدت سے جاری تھیں۔ اس کا خواب ۱۸۹۳ء میں دیکھا گیا۔ اس کی ادارت اور مضمون نویسی کے مردم سازی کا کام الندوہ کی تربیت گاہ میں ۱۹۰۴ء سے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ انتقال سے چند ماہ قبل علامہ شبلیؒ نے جب یہ رسالہ جاری کرنا چاہا تو اس کے لیے افراد تیار تھے۔ علامہ شبلیؒ نے اس کا مکمل خاکہ مرتب کر دیا تھا۔ اسٹاف سے لے کر اس کے موضوعات، ضخامت اور قیمت تک متعین کر دی تھی۔ مگر تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلیؒ نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ تین روز کے بعد ان کے تلامذہ نے مولانا حمید الدین فراہی کی صدارت میں مجلس اخوان الصفا قائم کی اور دارالمصنّفین کے انتظامات کا آغاز کر دیا گیا اور ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ گیا۔

یہ شمارہ جب تک دیکھا نہ تھا تعجب ہوتا تھا کہ معارف کی اشاعت کا آغاز جولائی کے مہینے سے کیوں ہوا! بظاہر درمیان سال کے بجائے جنوری ۱۹۱۷ء سے نکالنا زیادہ موزوں تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ آغاز جولائی سے نہیں بلکہ ماہ رمضان ۱۳۳۴ھ سے ہوا جو اس سال شمسی کیلنڈر کے حساب سے

جولائی میں پڑا تھا۔ اور یہ محض اتفاق نہ تھا بلکہ رمضان کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ اس شمارے کے شذرات کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے:

''رسالے کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینے سے شروع کرتے ہیں کہ ہمارے علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب اسی ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی۔ ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ''۔

یہ تو معارف کا مبارک آغاز تھا۔ اب دیکھیے کہ اس کے مقاصد کتنے اعلیٰ و اشرف تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسی شمارے میں معارف کے اجرا کے یہ آٹھ مقاصد بیان فرمائے ہیں:

۱۔ فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے۔

۲۔ عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔

۳۔ علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔

۴۔ علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔

۵۔ علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔

۶۔ اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں، جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات کی بحث ہو۔

۷۔ عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دکھایا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں۔

۸۔ اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے، ان پر محققانہ مضامین شائع کیے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آٹھ نکات کی صورت میں معارف کے ساتھ دارالمصنّفین کے قیام کے بنیادی مقاصد بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ کم و بیش یہی مقاصد ذرا اجمال کے ساتھ ماہنامہ الندوہ کے دستور العمل میں بھی ملتے ہیں کہ دونوں ایک ہی شخص کے تخیل کی یادگار تھے۔ جدید عہد میں مسلمانوں کی علمی و فکری نشأۃ ثانیہ کے لیے علامہ شبلی کے ذہن میں جو نقشہ تھا، اس کی ایک جھلک اس

آئینے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ایسے اعلیٰ مقاصد کے ساتھ رمضان المبارک کے مہینے میں معارف کا آغاز ہوا تو دارالمصنّفین اور معارف دونوں کی علمی ذمہ داریاں صرف دو افراد کے کندھوں پر تھیں: مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی ۔ ان کے ساتھ دو نوجوان معین الدین ندوی اور سعید انصاری بھی تھے، جو اس میدان میں ابھی نووارد تھے۔ایک طرف یہ مختصر جماعت اور بے سروسامانی کا عالم، دوسری طرف یہ عظیم مقاصد اور یہ ولولہ اور جذبہ۔ یہ منظر دیکھ کر شاید رحمت الٰہی کو جوش آیا اور اس نے ان کی کوششوں میں برکت ہی برکت رکھ دی۔

ان مقاصد کے بعد سید صاحب نے رسالے کے دوسرے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اگر صرف انہی مقاصد پر قناعت کر لی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے، لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے، اس لیے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوان سے ان کی تلخی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی''۔ گویا مقالات کے بعد قارئین کی دلچسپی کے لیے پانچ ابواب اور بھی رکھے گئے، چنانچہ پہلا شمارہ شذرات اور مقالات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل تھا۔

یہ شمارہ چونکہ ماہ رمضان میں نکلا تھا اس لیے اس کی مناسبت سے مقالات کے حصے میں پہلا مضمون روزے اور اعتکاف کے موضوع پر تھا۔ اس پر کسی کا نام نہیں ہے۔ شروع میں فہرست مضامین بھی مضمون نگاروں کے نام سے خالی ہے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ شذرات اور مضمون دونوں مدیر معارف سید صاحب کے قلم سے ہیں۔ دوسرا مضمون ''حریم قدس یعنی مسجد نبوی'' کے عنوان سے ہے اور اس میں مسجد نبویؐ کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس عنوان کے اوپر ایک جلی عنوان ''عمارات الاسلام'' قائم کیا گیا ہے اور تمہید میں اس ارادے کا اظہار ہے کہ یہ ایک مستقل باب ہوگا جس کے تحت مسلمانوں کی تاریخی عمارتوں پر محققانہ مضامین شائع کیے جائیں گے۔ یہ مضمون مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے اور ان کا نام مضمون کے آخر میں درج ہے۔ اس کے بعد دو مضامین اور ہیں، ایک رسم الخط کی تاریخ پر اور دوسرا ''حکیم بن زکریا رازی (چیچک کے علاج کے موجد)'' کے عنوان سے ہے جس میں مشہور فلسفی اور طبیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی کتاب ''الجدری والحصبۃ'' کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان مضامین کے

آخر میں بالترتیب معین الدین ندوی اور سعید انصاری کا نام درج ہے۔

مقالات کے بعد ''مباحث حاضرۃ'' کے باب میں علامہ شبلی کے سلسلۂ مضامین ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' کا ایک غیر مطبوعہ حصہ ''ہندو مسلمانوں کا اتحاد'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ تقریظ و انتقاد کے تحت نقد الشعر کے عنوان سے اکبرالہ آبادی کی شاعری پر مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی اے کا تبصرہ ہے۔ اس کی تمہید بظاہر سید صاحب نے لکھی ہے۔ تمہید نے طول کھینچا تو اصل مضمون کا آغاز دوسرے شمارے سے ہوا۔ ادبیات کے تحت علامہ شبلی کی نظم ''خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف'' اور اس کے بعد انہی کی ایک اور نا تمام نظم کے ساتھ اسرارالحق رمزی کی نظم ''سرالحیاۃ'' چھپی ہے۔ مطبوعات جدیدہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی اردو کتاب ''فلسفہ اجتماع'' اور انگریزی کتاب ''سائیکالوجی آف لیڈر شپ'' کے علاوہ سید نواب علی کی تصنیف ''معارج الدین'' اور مفتی انوارالحق کی ''حقائق الاسلام'' کا مختصر تعارف ہے۔ یہ تعارف بھی بظاہر سید صاحب کے قلم سے ہے۔

یہ معارف کا پہلا شمارہ تھا اور اس کے مشمولات تقریباً تمام ہی مدیر معارف اور ان کے رفقا نے مرتب کیے تھے۔ سید صاحب نے جون ۱۹۴۳ء کے شذرات میں لکھا ہے کہ ''رسائل کی دنیا میں معارف کے بہت سے اولیات ہیں''۔ اس کے بعد مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنے کو معارف کے اولیات میں شمار کیا ہے۔ پھر اس سلسلے میں معارف کے دو ادوار کا ذکر کیا ہے۔ پہلا اپریل ۱۹۱۹ء تک اور دوسرا اس کے بعد جون ۱۹۴۳ء تک جب وہ یہ شذرات لکھ رہے تھے۔ دور اول کے ابواب میں مذکورہ بالا ابواب کے ساتھ آثار علمیہ و ادبیہ اور تراجم شامل ہیں۔ دوسرے دور میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے دو ابواب کا اضافہ کیا۔ ایک ''تلخیص وتبصرہ'' جس میں مشہور انگریزی رسائل کے مضامین کا خلاصہ ہوتا تھا، اور دوسرا ''اخبار علمیہ''۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اخبار علمیہ کا باب الندوہ میں موجود تھا اور علامہ شبلی اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ سید صاحب کے زمانے میں ایک مرتبہ کئی ماہ تک ناغہ ہو گیا تو علامہ شبلی نے انہیں تنبیہ کی اور اسے ایک غلطی قرار دیا۔ لیکن یہ محض دو ابواب کے اضافے کا معاملہ نہیں تھا، دراصل معارف کے معیار و مزاج کے بارے میں مولانا دریابادی کا نقطہ نظر ہی الگ تھا۔ سید صاحب فروری ۱۹۱۹ء کے شذرات میں رقم طراز ہیں:

''معارف جس طرح اور جس شان سے نکل رہا ہے، ہمارے اکثر کرم فرما تو

اس پر قانع ہیں اور اس کو وہ اس حیثیت میں بھی اردو رسائل کی صف میں پہلی کرسی دینے پر تیار ہیں، لیکن ہمارے حلقہ احباب میں ان سے بلند نظر اصحاب بھی ہیں جو کہتے ہیں:

ما بایں قدر از توراضی نیستم اندر سخن

شبلیا سحر است ایں، اعجاز می بایست کرد

اس جماعت کے سرگرم ممبر ہماری مجلس کے رکن اعظم جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی اے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معارف اگر یورپ کے علمی رسالوں کے لگ بھگ نہ نکل سکے تو کم از کم ہندوستان کے انگریزی رسالوں کے قریب قریب تو ہو......"۔

اتفاق یہ کہ دو ہی مہینوں کے بعد اپریل ۱۹۱۹ء سے معارف کی ادارت عملاً مولانا دریابادی کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور اسی ماہ سے بعض تبدیلیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً اب تک مضمون نگار کا نام مضمون کے شروع یا آخر میں ہوتا تھا، مگر اس شمارے سے فہرست مضامین میں بھی لکھا جانے لگا۔ پھر جون کے شمارے میں شذرات کے بعد "معارف کے جدید تغیرات" کے عنوان سے مولانا دریابادی نے کئی تبدیلیوں کا اعلان کیا، جن میں سب سے اہم تبدیلی رسالے کے علمی مواد سے متعلق تھی۔ انہوں نے لکھا کہ شذرات میں ہر ماہ کے اہم علمی واقعات پر تبصرہ ہوگا۔ مقالات وغیرہ کی سرخیوں کے تحت مشرقی و مغربی علوم و مسائل خصوصاً یورپ کی جدید تحقیقات اور علوم و نظریات پر مضامین ہوں گے۔ یورپ اور امریکہ کے تمام علمی رسائل کا ماہوار خلاصہ درج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سیر العلم یا دنیا کی علمی رفتار کے نام سے ہر مہینے کے اکتشافات و ایجادات و نظریات علمی کی خبریں درج کی جائیں گی۔ غرض معارف کا ہر شمارہ ہر مہینے کی علمی ترقیوں کا آئینہ ہوگا۔

معارف کے مشمولات میں اس اہم تبدیلی اور اضافے کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کے صفحات کی تعداد ۵۸ سے ۸۰، اور اس کا سالانہ بدل اشتراک چار روپئے سے بڑھا کر پانچ روپئے کردیا گیا۔ صفحات میں اضافے کے ساتھ معارف کی ایک جلد جو بارہ شماروں پر مشتمل ہوتی تھی، اب چھ شماروں پر ختم ہونے لگی۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ایک اعلان اور کیا گیا، جس کا تصور بھی اس دور میں اردو کے کسی تحقیقی رسالے کے لیے محال نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ "بہترین علمی مضامین پر معارف کی طرف سے مضمون نگاروں کو معاوضہ دیا جائے گا"۔ قطع نظر اس سے کہ اس اعلان پر عمل ہوا یا نہیں، بجائے خود یہ

اعلان اس لائق ہے کہ اسے معارف کی اولیات میں شمار کیا جائے۔

اس نئے انداز پر معارف ۱۹۴۳ء تک نکلتا رہا۔ اس دوران بعض رسائل معارف کی تقلید کرنے لگے اور اس کی انفرادیت متاثر ہوتی نظر آئی، چنانچہ سید صاحب ابھی اس کے نہج میں تبدیلی کی فکر میں تھے کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور یورپ، امریکہ اور مصر سے رسائل کی آمد بند ہو گئی۔ آخر جون ۱۹۴۳ء سے تلخیص اور اخبار علمیہ کے ابواب کا التزام ترک کر دیا گیا۔

حضرات! معارف کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسے جس پائے کے مدیر، مرتب اور اداریہ نویس ملے، وہ شاید ہی کسی رسالے کو نصیب ہوئے ہوں، اور ان میں ایک دو کے سوا سب عالم دین ہونے کے ساتھ اردو کے ادیب و انشا پرداز بھی تھے۔ دارالمصنّفین کی روایت یہ ہے کہ اس کا ناظم ہی معارف کا مدیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ دارالمصنّفین کے ناظم اول مولانا سید سلیمان ندوی معارف کے مدیر اول تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ معارف کو جو بے مثال شہرت اور مقبولیت ملی وہ سید صاحب ہی کی جامع کمالات اور بلند و بالا مذہبی اور علمی شخصیت کا کرشمہ تھا۔ سید صاحب ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۰ء تک معارف کے مدیر رہے لیکن رسالے کی ترتیب اور بسا اوقات شذرات نویسی کا کام دوسرے رفقا نے انجام دیا۔ سید ریاست علی ندوی اور شاہ معین الدین ندوی ۱۹۲۴ء میں ندوے سے فارغ ہو کر دارالمصنّفین آئے تو سید صاحب نے اسی سال معارف کی ترتیب کی ذمہ داری سید ریاست علی ندوی کے سپرد کر دی۔ علامہ شبلی کی طرح سید صاحب نے بھی اپنے دور نظامت و ادارت میں اپنے شاگردوں کو اس کام کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جون ۱۹۴۶ء میں جب سید صاحب بھوپال منتقل ہوئے اور پھر ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے تو ان کے تربیت یافتہ تلامذہ کو یہ بار گراں اٹھانے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔ غور کیجیے تو دارالمصنّفین اور معارف کے لیے یہ بھی ایک خدائی انتظام تھا۔

بھوپال جانے کے بعد بھی دارالمصنّفین کے ناظم اور مدیر سید صاحب ہی رہے اور اس دوران گاہے گاہے وہ دارالمصنّفین تشریف لاتے رہے اور بھوپال سے بھی نگرانی اور سرپرستی فرماتے رہے۔ مگر ۱۹۵۰ء میں ان کا بالکلیہ ترک وطن دارالمصنّفین اور معارف دونوں کے لیے ایک زبردست سانحہ تھا۔ اس ادارے سے سید صاحب کا رشتہ ان کے جیتے جی ٹوٹ جائے گا، یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ بہر حال ان کے بعد دارالمصنّفین کے لیے جو نیا نظام برپا ہوا اس میں شاہ معین الدین ندوی

ناظم بنائے گئے اور معارف کے لیے ایک مجلس بنام ''مجلس ادارت'' وجود میں آئی۔ شاہ معین الدین صاحب اپریل ۱۹۵۱ء کے شذرات میں لکھتے ہیں: ''اس مہینے سے راقم نے اپنی ذمہ داری کو ہلکا کرنے کے لیے معارف کی مجلس ادارت قائم کردی ہے جن کے اسمائے گرامی ٹائٹل کے دوسرے رخ پر درج ہیں'' اس مجلس میں چھ نام ہیں: مولانا عبدالماجد دریابادی (صدر)، مولانا مناظر احسن گیلانی (رکن)، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (رکن)، مولانا عبدالسلام ندوی (رکن)، شاہ معین الدین ندوی (مرتب)، سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے (شریک مرتب)۔

تین ماہ بعد جولائی کے شذرات مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر فرمائے ہیں اور انہوں نے نئے نظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''معارف کی ادارت ایک مستقل مجلس کے سپرد کردی گئی ہے''۔ میرا خیال ہے معارف کے سرورق پر سید صاحب کا نام نہ ہونے سے جو زبردست خلا پیدا ہوا تھا اسے ان بھاری بھرکم ناموں کے ذریعہ پر کرنے کی یہ ایک کوشش تھی اور بس، معارف کی ادارت میں اس مجلس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وقت کے ساتھ اس اعزازی مجلس کے ارکان میں نئے ناموں کا اضافہ ہوتا رہا۔

حضرات! مقالات کا حصہ معارف کی جان ہے اور شذرات اس کا دیباچہ اور دریچہ، لیکن کئی پہلوؤں سے شذرات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی شمارے کے مقالات اتنے دقیق ہوں کہ بہت سے قارئین کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان نہ ہو مگر شذرات، معارف کے سارے ناظرین پڑھتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے شذرات ہی پڑھتے ہیں۔ اداریہ کے لیے شذرات کا لفظ اس سے قبل الندوہ میں استعمال کیا گیا تھا اور قیاس یہ ہے کہ یہ بھی علامہ شبلی کی ایجاد ہے اور اسے ان کی اولیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ شذرات سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو سونے کی کان سے چنے جاتے ہیں۔ تاریخ پر ابن العماد حنبلی (ف:۱۰۸۹ھ) کی کتاب ''شذرات الذهب فی تاریخ من ذهب'' مشہور ہے۔ اداریے میں مختلف موضوعات پر جو علاحدہ علاحدہ ٹکڑے لکھے جاتے ہیں ان کے لیے علامہ شبلی نے اس بلیغ لفظ کا انتخاب کیا تھا، پھر تو یہ ایسا عام ہوا کہ بہت سے لوگ اسے اداریے کا ہم معنی سمجھنے لگے۔ علامہ شبلی نے الندوہ میں جو شذرات لکھے وہ تو شذرات الذہب تھے ہی، ان کے جانشینوں نے معارف میں جو اداریے لکھے وہ بھی علم و ادب کا شاہکار تھے کہ یہ بزرگ جیسا کہ عرض کیا، بیک وقت عالم بھی تھے اور ادیب بھی، اور ان میں

سے بعض تو صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ سید صاحب کے زمانے میں ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ریاست علی ندوی، سید نجیب اشرف ندوی اور شاہ معین الدین ندوی نے شذرات لکھے۔ سید صاحب کے بعد ان کے جانشین شاہ معین الدین ندوی ہوئے۔ شاہ صاحب کو طویل زمانہ ملا۔ ان کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا عبدالسلام قدوائی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے شذرات تحریر کیے اور اب یہ شمع پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور ان کے معاون مولانا عمیر الصدیق دریابادی کے سامنے رکھی ہوئی ہے اور یہ حضرات شذرات لکھ رہے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں جب معارف کی ادارت مولانا دریابادی کے ذمے ہوئی تو انھوں نے سید صاحب کی تصریح کے مطابق شذرات میں ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال کی طرح ڈالی۔ اس طرح شذرات میں علمی و تحقیقی معلومات کے ساتھ اہم ملی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل زیر بحث آئے۔ علمی وادبی تنظیموں، اداروں، کتب خانوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کا تذکرہ ہوا۔ ممتاز سیاسی وسماجی اور علمی وادبی شخصیتوں کی وفات پر شذرے لکھے گئے۔ حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی گئی۔ دارالمصنّفین اپنے منصوبے کے مطابق نو بہ نو کتابوں کے جو ڈھیر لگا رہا تھا ان کا مژدہ بھی سنایا گیا اور جن مشکلوں اور آزمائشوں سے گزر رہا تھا ان سے بھی آگاہ کیا گیا۔ ان نثر پاروں بلکہ جواہر پاروں میں خبریں اور معلومات بھی ہیں۔ جائزے، تجزیے اور تبصرے بھی، تجاویز اور مشورے بھی۔ اور یہ سب کچھ کبھی تفصیل اور اکثر اجمال کے ساتھ، مگر بہر صورت توازن اور اعتدال کے ساتھ اور زبان عموماً سہل و سلیس ہونے کے ساتھ شستہ و شگفتہ اور باوقار و شائستہ۔

شذرات میں ذیلی عنوان نہیں دیے جاتے، اس لیے ان میں معلومات اور مطالب کا جو خزانہ دفن ہے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ یہ گنجینۂ معارف ایک مستقل کلید چاہتا ہے جس میں انہیں موضوعات کے مطابق مرتب کیا گیا ہو۔ دارالمصنّفین نے ابھی اس بند خزانے کا صرف ایک حصہ معارف کے دو ضخیم شماروں کی صورت میں عام کیا ہے اور وہ بھی وسائل کی کمی اور صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے مکمل نہیں بلکہ انتخاب ہے۔ اس حصے کا موضوع ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ہیں۔ یہ انتخاب ظلی صاحب کے الفاظ میں "ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی بھی ہے اور ان کا اعمال نامہ بھی، ان کی امیدوں، آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی جلوہ گاہ بھی ہے اور ان کی مشکلات اور مسائل کی ایک دل گداز داستان بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدیران معارف نے ملی مسائل پر لکھتے ہوئے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے اور اگر ان کی زبان سے

یہ کہا جائے کہ ؎

من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

تو بیجا نہ ہوگا''۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان جس نازک دور سے گزر رہے ہیں اس کے پیش نظر شذرات کا یہ انتخاب نہایت برمحل اور بروقت ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے موضوعات پر بھی شذرات کے مجموعے شائع کیے جائیں۔

حضرات! دارالمصنّفین کے علمی کاموں کا آغاز جیسا کہ گزرا، چار افراد مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کے دو معاونین حاجی معین الدین ندوی اور سعید انصاری سے ہوا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ علم و تحقیق کا ایک کارواں بنتا گیا، جس میں سید صاحب کے دوسرے خواجہ تاش بھی تھے اور ایسے باصلاحیت نوجوان بھی آ ملے جنھوں نے سید صاحب کے فیض تربیت سے بہت جلد محققین کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی۔ پہلی جماعت میں مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ ایک حد تک مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی شمار کر سکتے ہیں، اور دوسری میں سید ریاست علی ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید نجیب اشرف ندوی، سید ابوظفر ندوی، ڈاکٹر محمد عزیر، مولانا ابوالحسنات ندوی، محمد یوسف کوکن، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا اویس نگرامی ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی اور مولانا مجیب اللہ ندوی شامل ہیں۔ شاہ معین الدین ندوی کے دور میں مزید رفقا کا اضافہ ہوا جن میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی اور مولانا نعیم صدیقی ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (دوسرے رفقاء کے لیے ملاحظہ ہو: ''دارالمصنّفین کے سو سال'' از کلیم صفات اصلاحی)

شروع کے پرچے زیادہ تر سید صاحب اور ان کے رفقا کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے مگر چند ہی شماروں کے بعد دوسرے مشاہیر کے مضمون بھی آنے لگے، پھر تو معارف کے صفحات پر ارباب کمال کی وہ کہکشاں جلوہ افروز ہوئی جس کی مثال اردو رسائل کے آسمان پر دور دور تک نظر نہیں آتی۔ یہاں ایک مختصر اور نامکمل فہرست ان اہل قلم کی ملاحظہ ہو جن کی تحریریں معارف کی زینت بنیں۔ اس فہرست میں آپ کو دینی علوم کے ساتھ فلسفۂ قدیم و جدید، تاریخ اور دوسرے علوم کے ماہرین ملیں گے۔ اس میں ایسے یکتائے روزگار بھی شامل ہیں جو اپنے میدانوں کے شہسوار ہی نہیں قافلہ سالار بھی تھے اور ان کا آوازہ برصغیر سے نکل کر اقصائے عالم تک پہنچا۔ اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے ایسے

برگزیدہ محققین بھی ہیں جن کی تحقیقات کے سامنے عرب وعجم نے سر نیاز خم کیا۔اورانہی میں کتنے ایسے ہیں کہ جب ان کا مضمون معارف میں چھپا تو ان کی شہرت کا آفتاب ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ایک خصوصیت اس فہرست کی یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف مسلکوں،فرقوں بلکہ مذاہب سے تعلق رکھنے والے اہل علم شامل ہیں۔

عمادالملک بلگرامی،حبیب الرحمن شروانی،مہدی افادی،ابوالکلام آزاد،اقبال سہیل،محمد یونس فرنگی محلی،محفوظ الحق،عبدالعزیز میمن،محمد سورتی،بدرالدین علوی،مناظر احسن گیلانی،ظفر احمد تھانوی، ابوالاعلیٰ مودودی،امین احسن اصلاحی،مسعود عالم ندوی،ابوالحسن علی ندوی،محمد حمیداللہ،حبیب الرحمن اعظمی،شبیر احمد خاں غوری،سعید احمد اکبرآبادی،صغیر حسن معصومی،ابومحفوظ الکریم معصومی،عبدالسلام خاں رامپوری،قاضی اطہر مبارک پوری،تقی امینی۔

شیخ عبدالقادر،سرشاہ سلیمان،نصیر احمد عثمانی،سید نواب علی،عبداللہ چغتائی،محمد ابراہیم ڈار،شیخ عنایت اللہ،زبید احمد،قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی،ہوش بلگرامی،نصیرالدین ہاشمی،حامد حسن قادری، جعفر علی خاں اثر لکھنوی،خواجہ عبدالرشید،ضیاءالدین برنی،غلام رسول مہر،اختر علی تلہری،ابویحییٰ امام خاں نوشہروی،سید عابد حسین،محمد مجیب،رشید احمد صدیقی،سید وقار عظیم،میر ولی الدین،صوفی غلام مصطفی تبسم،آصف علی اصغر فیضی،غلام دستگیر رشید،خلیق احمد نظامی،حامداللہ ندوی۔

عبدالستار صدیقی،زبیر صدیقی،امتیاز علی عرشی،قاضی عبدالودود،نذیر احمد،امیر حسن عابدی، خواجہ احمد فاروقی،محمد ایوب قادری،مالک رام،کالی داس گپتا رضا،پرمیشر لال،پنڈت منوہر لال زتشی، جتندر ناتھ چکرورتی،پنڈت کشن پرشاد کول،پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی،گنگا ناتھ،انیل پرشاد، برہم دت شرما،مدن مراری لال،رام لعل نابھوی،گوردیال سنگھ مجذوب،جگن ناتھ آزاد۔

دارالمصنّفین کے نامور رفقا اوران مایہ ناز مقالہ نگاروں کے تحقیقی مضامین،متوازن فکر ونظر اور دل پذیر انداز تحریر نے معارف کو اردو رسائل میں ایک انفرادیت عطا کی،اوراس نے ایسا اعلیٰ معیار قائم کیا کہ اس میں کسی مضمون کی اشاعت اس کے معیاری ہونے کی سند اوراہل علم کی نظر میں آنے کی ضمانت قرار پائی۔

موضوعات کے تنوع کا یہ عالم کہ قرآنیات،حدیث وفقہ،سیرت نبوی،تذکرہ وسوانح،اسلامی

تعلیمات، اسلامی نظام کے مختلف پہلو، عقائد، عبادات، تصوف، تہذیب وتمدن، فلسفہ، دوسرے مذاہب اور فرقوں کا مطالعہ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، تاریخ عالم، علوم وفنون کی تاریخ اوران کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، تعلیم وتربیت، سائنس، کتب خانوں اور مخطوطات کا تعارف، استشراق ومستشرقین، لسانیات، عربی فارسی اور اردو کی ادبیات، غرض کون سا علم یا فن ہے جس پر مضامین معارف کے ان سو سالہ شماروں میں نہ چھپے ہوں، اور فکر ونظر کے کون سے گوشے ہیں جن پر کسی صاحب علم نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ مقالات کا ایسا تنوع اور یہ معیار اسلامیات کے کسی اور رسالے میں مشکل سے ملے گا۔

علامہ اقبال نے جب یہ فرمایا تھا کہ ''یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں اضافہ ہوتا ہے'' تو وہ سید صاحب کا زمانہ تھا اور علامہ اقبال کے اس ارشاد میں معارف کے ایک خاص رخ کی جانب اشارہ تھا جو اسے اس دور کے دوسرے علمی رسائل سے ممتاز کرتا تھا۔ لیکن ہمارے عہد کے مایہ ناز ماہر اسلامیات ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے یہ فیصلہ ۱۹۷۳ء میں صادر فرمایا کہ ''آج کل ساری دنیائے اسلام میں عرب ہو کہ عجم، کوئی رسالہ اسلامیات پر اعظم گڑھ والے معارف کے معیار کا نہیں ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں عالم اسلام کے سارے اہم اسلامی رسائل تھے، اس لیے ان کے ارشاد کو ناواقفیت اور مبالغے پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

حضرات! سید صاحب جب معارف کے اولین شمارے میں اس کے اجرا کے اغراض و مقاصد متعین فرمارہے تھے تو انہوں نے ''ادبیات'' کا ذکر ان ابواب میں کیا تھا جو بنیادی مقالات کی خشکی اور تلخی کو دور کرنے کے لیے شامل کیے گئے تھے، اور عملاً ہوا بھی یہی کہ آج تک اس عنوان کے تحت منظومات شائع کی جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادبیات سے ان کی مراد یہی منظومات تھیں۔ حالانکہ علامہ شبلی نے ایک قلمی یادداشت میں معارف کے لیے جو موضوعات لکھے تھے، ان میں ادبیات کے ساتھ ''اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب'' کا عنوان بھی تھا، اور بہت پہلے ۱۸۹۳ء میں المعارف کی جو تجویز شائع کی تھی اس کے موضوعات میں ''عربی فارسی اور اردو زبان کی انشا پردازی اور علم اللسان کی تحقیقات'' کا عنوان باقاعدہ شامل تھا۔ (آثار شبلی: ۵۶۹، ۵۷۰)۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب جس وقت معارف کے اعلیٰ مقاصد لکھ رہے تھے ان کے پیش نظر ماہنامہ الندوہ کے مقاصد تھے اور ان

مقاصد کی فہرست میں اس موضوع کا ذکر نہیں تھا۔ بہرحال زبان و ادب کے موضوعات معارف کے دائرے سے خارج ہرگز نہیں تھے، چنانچہ عربی فارسی اور اردو ادبیات پر معارف میں کثرت سے مقالات شائع ہوئے، یہاں تک کہ بعض خصوصی موضوعات مثلاً غالبیات اور اقبالیات پر مضامین کا ایک بیش قیمت ذخیرہ اس کے شماروں میں محفوظ ہے، جو اگر شائع کیا جائے تو اس کے لیے جلدوں کی جلدیں درکار ہوں گی۔ اقبالیات پر سو سے زیادہ مقالات شائع ہوئے ہیں اور ان کا سلسلہ علامہ اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ فارسی زبان و ادب پر تنہا پروفیسر نذیر احمد صاحب کے مقالات تقریباً اسّی شماروں میں شائع ہوئے۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جسے فارسی کے اس نامور محقق کے مقالات اتنی بڑی تعداد میں شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہو۔

۱۹۴۳ء میں معارف کے ابواب میں ایک باب ''استفسار و جواب'' کا اضافہ ہوا۔ سید صاحب جون کے شمارے میں لکھتے ہیں: ''دارالمصنّفین میں اطراف ملک سے علمی سوالات اکثر آتے رہتے ہیں اور ان کے جوابات جاتے رہتے ہیں۔ اب اس خیال سے کہ ہمارے رفقا کی یہ محنت جو جوابوں پر صرف ہوتی ہے بیکار کیوں جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان جوابات میں جو ایسے ہوں جن میں عموم فائدہ کا پہلو ہو، معارف میں وقتاً فوقتاً شائع کیے جاتے رہیں۔ اسی لیے پچھلے پرچے سے سوال و جواب کا باب بڑھا دیا ہے''۔

بظاہر یہ ایک ضمنی باب معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ مقالات کا ہم پلہ تھا اور اس کے تحت ایسے نفیس مضامین چھپے ہیں کہ پڑھنے والا کبھی اش اش کرتا ہے اور کبھی عش عش! اس سوال و جواب کی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ جون کے شمارے میں اس باب کے تحت جو مضمون چھپا ہے اس کا عنوان ہے ''سلطان شہاب الدین کے قاتل، مقتل، مرقد اور چند دوسرے استفسارات''۔ یہ سارے سوالات ضلع جہلم سے ایک صاحب محمد اسلم خاں نے بھیجے تھے۔ ان میں بنیادی سوال سلطان شہاب الدین غوری کی قبر کے بارے میں تھا اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ ضلع جہلم میں ایک چھوٹا سا گاؤں دھمک ہے۔ عوام میں مشہور ہے کہ سلطان وہیں قتل ہوا اور اس کی تربت بھی وہیں ہے۔ خاں صاحب نے لکھا کہ اکثر تعلیم یافتہ بھی اس داستان کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، اس لیے اس کے بارے میں ایک مضمون معارف میں شائع کریں کہ سلطان کو کس نے قتل کیا؟ شہید کرنے کی وجہ کیا تھی؟ سلطان کا مرقد کہاں

ہے؟اس کے ہمراہی کتنے تھے جو قتل ہوئے؟ یہ واقعہ کس مقام پر ہوا؟ کیا اس کا تاریخی نام دھمک ہے؟ اس کے بعد تاریخ فرشتہ کے حوالے سے یہ نقل کرتے ہوئے کہ سلطان محمود کے ساتھ کفار گھکروں نے مقابلہ کیا، جس سے سلطان کی بے شمار فوج ماری گئی اور انہوں نے ہی سلطان شہاب الدین کو قتل کیا، خان صاحب نے کچھ اور سوالات کے بھی تشفی بخش جواب طلب کیے۔ یہ دلچسپ سوالات آپ بھی سنیے:

۱۔ قوم گھکر کی اصل کیا ہے؟ کیا یہ کیانی النسل ہے یا ہندوستانی الاصل؟

۲۔ ترک، کیانی، مغل، تاتاری، کیا چاروں قومیں ایک ہی نسل سے ہیں یا علاحدہ؟

۳۔ بعض مورخین نے فی صدی تین پشتیں شمار کی ہیں، کیا یہ درست ہے؟ خان صاحب کا اشارہ ابن خلدون کی جانب ہے۔

۴۔ اکبر کے حوالے سے یہ اعتراض کہ ہندو بیویوں سے اس کی اولاد شرعاً اور اخلاقاً ناجائز ہے۔

۵۔ تاریخ فرشتہ کے مقبول عام ہونے کی وجہ؟ فرشتہ کے باپ کا نام کیا تھا؟ واقعی قتل ہوا تھا؟ کیوں اور کس جگہ؟

۶۔ خاندان مغلیہ سے پہلے دربار میں حفظ مراتب کا قاعدہ تھا یا نہیں؟ نیز ہفت ہزاری، پنج ہزاری وغیرہ سے کیا مراد ہے؟

۷۔ ہند میں قبل از حکومت برطانیہ مال گزاری کی تشخیص کا کیا طریقہ تھا؟ اور وصولی کا کیا نظام تھا؟

۸۔ شیر شاہ سوری کی جانب منسوب بنگال سے پشاور تک کی سڑک، یہ درست ہے یا ویسی ہی گپ ہے؟

پہلے اور بنیادی سوال کا جواب دس صفحات میں دیا گیا ہے اور باقی سوالوں کا اختصار کے ساتھ آٹھ صفحات میں ہے۔

اس باب کے تحت تقریباً سارے جوابات مولانا ریاست علی ندوی کے قلم سے ہیں اور نہایت دقت نظر اور عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ افسوس کہ ۱۹۵۰ء میں وہ دارالمصنّفین سے علاحدہ ہوگئے اور یہ ادارہ ایک بلند پایہ مورخ اور محقق سے محروم ہوگیا۔ ان کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا، اور ۲۶ سال کے اس عرصے میں چار صفحوں کے ایک مضمون کے سوا ان کا کوئی مضمون معارف میں شائع نہیں ہوا۔

مشاہیر کے انتقال پر تاثرات کا اظہار ابتدا میں شذرات ہی میں ہوتا تھا۔ پھر جون ۱۹۴۳ء

سے عبداللہ چغتائی کے مشورے پر وفیات کو مستقل باب کی حیثیت دی گئی۔اس کا دائرہ اگرچہ وسیع تھا اور اس باب میں سیاسی وسماجی شخصیتوں کی موت پر بھی لکھا گیا،لیکن بڑا حصہ علما محققین اور ادبا و شعرا سے ہی متعلق ہے۔اس پہلو سے دیکھیے تو معارف کے ابواب میں یہ باب بھی بے حد اہم ہے کہ اس سے ان فضلا کے ذاتی محاسن وکمالات کے ساتھ ان کے علمی وادبی کارناموں سے آگاہی ہوتی ہے۔اس باب کی سب سے اعلیٰ تحریریں سید صاحب نے لکھی ہیں اور ان میں بھی شاہکار وہ نثری مرثیہ ہے جو انہوں نے مولانا حمید الدین فراہی کے انتقال پر ''الصلاۃ علی ترجمان القرآن'' کے عنوان سے لکھا۔

سید صاحب کے بعد شاہ معین الدین صاحب نے وفیات لکھیں،لیکن شاید انہیں اس موضوع سے زیادہ مناسبت نہیں تھی اس لیے اس موضوع پر ان کی تحریروں میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن،مولانا عبدالسلام قدوائی،مولانا ضیاء الدین اصلاحی،سید شہاب الدین دسنوی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی،مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی اور دوسرے رفقا نے اس موضوع پر سیر حاصل تحریریں لکھی ہیں۔

وفیات کی ایک خاصی تعداد دارالمصنّفین کے رفقا کے علاوہ دوسرے اہل علم کے قلم سے بھی ہے۔ان میں رشید احمد صدیقی،شیخ نذیر حسین،ڈاکٹر محمد اسلم،پروفیسر مختار الدین احمد اور پروفیسر مسعود حسن کے نام شامل ہیں۔

مئی ۱۹۴۸ء کے شمارے میں سید صاحب نے تین بزرگوں مولانا ثناء اللہ امرتسری،مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا ابوالبرکات داناپوری کی وفات پر لکھا تو مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک خط میں انہیں اپنے مخصوص اچھوتے اسلوب میں یوں مبارک باد دی:

> ''وفیات ثلاثہ کو پڑھ کر ''ندویت صحیحہ وقراح'' کا عجیب وغریب نتیجہ نظر کے سامنے آیا،ایک ہی قلم سے ایک ہی اشاعت میں ایک اہل حدیث اور ایک طائفہ قبریہ اور ایک برزخی دین رکھنے والے تین تین مختلف النقاط والجہات اہل علم کے متعلق ہر قسم کی جانب داری سے پاک رہتے ہوئے،ہر ایک کے علم اور خدمات کا اعتراف اس ندویت کا عجیب وغریب نمونہ ہے جس کے لیے ندوہ قائم ہوا تھا۔لیکن شاید یہی پہلا نمونہ ہے اور یہی

آخر بھی"۔

بلاشبہ یہ اس ندویت کا پہلا نمونہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے یہ اس کا آخری نمونہ نہیں تھا جیسا کہ مولانا گیلانی کو اندیشہ تھا۔ دارالمصنّفین اور معارف کا خمیر ہی اُس ندویت سے تیار ہوا تھا جس کے لیے ندوہ قائم کیا گیا تھا اور جس کو قائم رکھنے کے لیے علامہ شبلی اس وقت تک جدوجہد کرتے رہے جب تک وہ مکمل طور پر مایوس نہیں ہوگئے۔ علامہ شبلی کے تلامذہ اور ان کے جانشینوں نے دارالمصنّفین میں اس "ندویت صحیحہ وقراح" کی حفاظت کی۔ چنانچہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایسی مختلف الجہات شخصیتیں معارف کے کسی ایک شمارے میں جمع نہ ہوئی ہوں لیکن وفیات کے اس باب میں جن اشخاص کا ماتم کیا گیا ہے ان میں مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی، عیسائی بھی اور یہودی بھی، سنی بھی ہیں اور شیعہ اور اسماعیلی بھی، اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی بھی، قدامت پسند اور تجدد پسند بھی، دیندار اور ملحد بھی، علماو مشائخ بھی اور رند خرابات بھی۔ اور ان سب کے بارے میں اسی بے تعصبی، اعتدال اور غیر جانب داری سے لکھا گیا ہے جو شروع سے معارف کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اخبار علمیہ اور مطبوعات جدیدہ بھی بظاہر ضمنی ابواب ہیں لیکن وہ بھی معارف کے اعلیٰ مقاصد کے خادم ہیں اور قارئین کے لیے دلچسپی اور افادیت رکھتے ہیں۔ دارالمصنّفین کی شہرت اور معارف کی غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت کی بنا پر نئی کتابیں برائے تبصرہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آتی رہی ہیں اور یہ تبصرے اہل علم اور طلبہ کو تازہ مطبوعات سے باخبر رہنے اور ساتھ ہی ان کی خوبیوں اور خامیوں سے یک گونہ واقفیت حاصل کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہیں۔

معارف کے ابواب میں ایک ہی باب ایسا ہے جس پر وہ بات صد فیصد صادق آتی ہے جو سید صاحب نے مقالات کے علاوہ باقی ابواب کے لیے فرمائی تھی کہ یہ مقالات کی تلخی دور کرنے کے لیے بڑھائے گئے ہیں یعنی "ادبیات" کا باب جس کے تحت قطعات نظمیں اور غزلیں شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن سوسال کے بعد اب پلٹ کر دیکھیے تو وہ جو ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے معارف کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ ہماری تاریخ حال کا وثیقہ اور ماخذ ہوگا تو یہ باب بھی کسی وثیقے سے کم نہیں۔ اس باب کے تحت قطعات تاریخ کثرت سے چھپے ہیں، ان کے وثیقہ ہونے میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ مرحومین کی تاریخ وفات جاننے کا ایک اہم اور مستند ذریعہ ہیں۔ یہ قطعات اور دوسری منظومات اردو میں بھی ہیں اور فارسی

میں بھی۔ جن شعرا کے کلام نے اس باب کو زینت بخشی ہے ان میں علامہ شبلی کے علاوہ چند نام یہ ہیں:

اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، وحید الدین سلیم، اقبال سہیل، نیاز فتح پوری، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، محمد علی جوہر، محمد اسلم جیراجپوری، جگر مرادآبادی، شاد عظیم آبادی، فانی بدایونی، ہوش بلگرامی، جوش ملیح آبادی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، تسکین قریشی، امجد حیدرآبادی، کیفی چریا کوٹی، اسد ملتانی، ماہر القادری، احسان دانش، حفیظ ہوشیار پوری، محوی صدیقی، جلیل قدوائی، روش صدیقی، اختر انصاری، بسنت کمار بسنت، چندر پرکاش جوہر، جگن ناتھ آزاد۔

ان شعرا میں وہ بھی ہیں جن کے کلیات چھپ چکے ہیں اور وہ بھی جن کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا یا ایک دو مجموعے چھپے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ معارف میں ان کا جو کلام چھپا ہے وہ ان میں شامل ہو۔ ایسی صورت میں ان شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے یا اسے مرتب کرنے والے محققین کیا معارف کے باب ''ادبیات'' سے بے نیاز ہو سکتے ہیں؟

ماہنامہ معارف ایک روز اسلامیات کا دائرۃ المعارف بن جائے گا، یہ بات معارف کے مدیران گرامی کے ذہنوں میں بہت پہلے سے تھی۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کے آخر میں گزشتہ پرچوں کے اشتہار کا عنوان ہی ''دائرۃ المعارف یعنی رسالہ معارف کی گذشتہ جلدیں'' دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک زمانے سے ہر جلد کے آخر میں اس کے مضامین اور مضمون نگاروں کی جو فہرست چھپتی ہے اس کے سرورق پر بھی ''دائرۃ المعارف یعنی معارف اعظم گڑھ'' درج ہوتا ہے۔ شاہ معین الدین صاحب نے ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ ''معارف نے سیکڑوں علمی موضوعوں اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جا سکتی ہے''۔

شاہ صاحب نے یہاں صرف مضامین کا ذکر کیا ہے کہ وہ معارف کی اصل واساس ہیں، لیکن ابھی ہم نے دیکھا کہ معارف کی صد سالہ فائل کا ہر شمارہ اب شذرات سے لے کر ادبیات اور مطبوعات جدیدہ تک، اپنے اساسی اور غیر اساسی ابواب سمیت مکمل طور پر ایک علمی دستاویز اور وثیقے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

معارف نے ان سو برسوں میں مسلمانوں کی علمی زندگی میں کیا انقلاب برپا کیا اور اسے کن

کن جہتوں سے متاثر اور منور کیا، یہ جاننا ہو تو اس کے پیش رو ماہنامہ الندوہ کے بارے میں سید صاحب نے حیات شبلی میں جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

"اس رسالے نے سیکڑوں برس کے بعد علما کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی تھی۔ اب تک علما کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا وہ ان ہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا۔ منطق و فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا، غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا، یہ علما کے مشاغل تھے۔ حالانکہ زمانے کا رخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیے تھے۔ الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں لیکن انہوں نے اس کو پڑھا اور اور پڑھنے پر مجبور ہوئے"۔

یاد رہے کہ الندوہ کے جن مضامین نے یہ جمود توڑا تھا ان میں سے بیشتر علامہ شبلی کے قلم سے نکلے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انقلاب حقیقت میں علامہ شبلی کی تحریروں کا رہین منت تھا۔ الندوہ کے علمی نتائج کا یہ ایک رخ تھا، دوسری طرف اس نے سید صاحب کی زبان میں "جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا، اسلام اور تاریخ اسلام پر بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا اور اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا"۔

حضرات! علامہ شبلی کا الندوہ آٹھ سال نکلا۔ یہ آثار و نتائج جن کا ذکر سید صاحب نے کیا وہ اسی قلیل مدت کے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں الندوہ بند ہوا اور چار سال بعد ۱۹۱۶ء میں معارف نکلا۔ الندوہ نقش اول تھا تو معارف نقش ثانی، اس فرق کے ساتھ کہ نقش اول بنیادی طور پر استاد کا تھا اور نقش ثانی اس کے تربیت یافتہ شاگردوں کا۔ الندوہ معارف کا مقدمۃ الجیش بھی تھا اور بدرقہ بھی۔ معارف نکلا تو اس کے لیے زمین ہموار تھی اور اس کی آواز اب اجنبی اور نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سو سال تک مسلسل نکلتا رہا اور اب بھی نکل رہا ہے۔ اگر وہ آثار و نتائج جن کا ذکر ابھی کیا گیا الندوہ نے آٹھ سال کی مختصر مدت میں پیدا کیے تھے تو معارف نے سو سال کے طویل عرصے میں مسلمانوں کی علمی

اور ادبی زندگی میں کیسا عظیم انقلاب برپا کیا ہوگا اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔

الندوہ کے ذریعے علامہ شبلی نے اسلامی موضوعات پر جدید انداز میں علمی و تحقیقی مضامین لکھنے والوں کی جو جماعت تیار کی تھی اسی نے معارف کا کام سنبھالا، پھر اس جماعت نے ایک نئی جماعت تیار کردی۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو دارالمصنّفین میں عملاً سرگرم رہے اور اپنے جانشینوں کی تربیت کرتے رہے کہ اسلام کی یہ خدمت کسی حال میں رکنے نہ پائے۔ لیکن اس کے ماسوا خود معارف نے قدیم و جدید دونوں حلقوں سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ اہل قلم کی ایک نسل بلکہ کئی نسلیں تیار کیں جن میں دسیوں ایسے ہیں جن کا شمار بعد میں مشاہیر میں ہوا۔

الندوہ کی طرح معارف کے مضامین سے بھی مسلمانوں کا ہر علمی طبقہ متاثر ہوا، قطع نظر اس سے کہ وہ خوش ہوا یا ناخوش، تحسین کی نظروں سے دیکھا یا تنقید کی۔ فائدہ دونوں صورتوں میں ہوا اور ان سب نے اپنی تحریروں میں معارف کے اس نئے انداز کی تقلید کی کوشش کی۔ یہ بھی اس انقلاب کا ایک رخ تھا جو معارف کے ذریعہ مسلمانوں کی علمی زندگی میں پیدا ہوا۔

اہل قلم کے علاوہ معارف کی دانش گاہ سے گذشتہ سو سال میں جو عام ناظرین نسلاً بعد نسل فیضیاب ہوئے اور جن کے ذریعے مسلم معاشرے میں علم و ادب کا چرچا ہوا، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچے گی۔

معارف کا ایک فیضان یہ بھی ہوا کہ ملک کے طول و عرض میں بہت سے علمی و تحقیقی رسائل وجود میں آئے۔ ان کے دائرے معارف سے الگ تھے یا محدود لیکن ان کے معیار اور انداز میں معارف کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ ایک رسالہ تو ایسا تھا کہ اہل علم کی زبانوں پر معارف کے ساتھ اس کا ذکر خود بخود آجاتا ہے۔ میرے نزدیک ماہنامہ برہان درحقیقت معارف ہی کا فیضان تھا، بلکہ جس ادارے کا وہ ترجمان تھا یعنی ندوۃ المصنّفین، اس کا نام بھی ندوۃ العلماء کے پہلے اور دارالمصنّفین کے آخری جز سے مرکب تھا۔ برہان ۱۹۳۸ء میں نکلا اور ابھی اپنی عمر کی پانچویں دہائی میں تھا کہ اس کے مدیر اول مولانا سعید احمد اکبرآبادی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور افسوس کہ ان کی وفات کے ساتھ ہی اس موقر رسالے کے دن بھی پورے ہوگئے اور چند برسوں کے بعد بند ہوگیا۔

برہان سے قبل ۱۹۲۵ء میں لاہور سے اورینٹل کالج میگزین نکلا تھا۔ اس کے قدیم شماروں میں

اسلامی تمدن اور علوم وفنون پر جو بلند پایہ مضامین نکلے وہ معارف کی یاددلاتے ہیں۔ کتنے عنوان ایسے ہیں جن پر دونوں رسالوں میں مضامین شائع ہوئے اور کتنے اہل قلم ایسے ہیں جن کے مضامین دونوں رسالوں میں چھپتے تھے۔ یہ میگزین جواب بھی نکلتا ہے، سہ ماہی تھا اور اس کی وہ شناخت بھی نہیں تھی جو معارف اور برہان کی تھی۔

اس موقع پر ایک اور رسالہ یاد آرہا ہے مگر یاد آنے کا سبب کچھ اور ہے۔ ۱۹۴۹ء میں لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم ہوا تو اس کا ترجمان ''ثقافت'' کے نام سے نکلا، مگر شیخ اکرام نے ۱۹۶۸ء میں کسی وجہ سے اس کا نام بدل کر ''المعارف'' رکھ دیا۔ یہ وہی نام ہے جو علامہ شبلی نے ترکی سے واپسی کے بعد اپنے رسالے کے لیے تجویز کیا تھا۔ علامہ شبلی کی کرامت دیکھیے کہ ان کا یہ نام بھی رائگاں نہیں گیا اور ایک مدت دراز کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے کام آیا!

الغرض معارف کے بعد برصغیر میں مذہبی اور علمی وادبی رسائل ماہانہ یا سہ ماہی اس کثرت سے نکلے کہ ان کا شمار دشوار ہے، اور یہ سب کسی نہ کسی رخ سے معارف سے متاثر تھے۔ ان رسائل نے اپنے اپنے حدود میں جو خدمات انجام دیں اور علم کی جو روشنی پھیلائی اس میں کچھ نہ کچھ حصہ معارف کا ضرور ہے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، معارف کے بعد جو رسائل نکلے ان میں کئی جہتوں سے معارف سے سب سے زیادہ قریب بلکہ اس کا ہم چشم ماہنامہ برہان تھا۔ اسی بنا پر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ۱۹۶۶ء میں ''علوم اسلامیہ کا انسائیکلو پیڈیا'' کے نام سے جو اشاریہ مرتب کرنا شروع کیا تھا اس میں انہوں نے معارف کے ساتھ برہان کو بھی شریک کیا۔

اشاریے کے بغیر رسائل کی حیثیت ایک ایسے خزانے کی ہوتی ہے جس کی کلید کھوگئی ہو۔ خصوصاً جو رسائل مدتوں پہلے بند ہوگئے یا جو ایک طویل عرصے سے نکل رہے ہیں اور ان کے قدیم شمارے ہر کتب خانے میں دستیاب نہیں، ان کی فائلوں میں علم کے جو لعل و گہر مدفون ہیں ان کا سراغ کیسے لگے؟ اشاریہ نہ ہو تو کسی محقق کو یہ کیوں کر معلوم ہو کہ وہ جس موضوع پر تحقیق کر رہا ہے اس پر اب تک کتنا کام ہوا ہے؟ اس ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کام کا آغاز وہیں سے کرتا ہے جہاں سے اس کے پیش رووں نے کیا تھا اور بسااوقات ان سے آگے جانے کے بجائے دو قدم ان سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس ناقص تکرار سے علم کی ترقی تو ہونے سے رہی، البتہ وقت، محنت، صلاحیت اور وسائل کا زیاں ضرور ہوتا ہے۔

ماہنامہ برہان کا مکمل اشاریہ کچھ دنوں پہلے پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔ معارف کے اشاریے کا کام باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت دارالمصنّفین کے سابق ناظم مولانا ضیاءالدین اصلاحی کے دور میں شروع ہوا اور ایک حد تک مکمل بھی ہو چکا تھا، مگر ان کی زندگی میں اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ ۲۰۱۱ء میں اس کی جلد اول منظر عام پر آئی جو صرف موضوعات پر مشتمل ہے۔ یہ اشاریہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے مرتب کیا ہے اور ۱۹۱۶ء سے ۲۰۱۱ء تک ۹۵ سال کے شماروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس دوران ایک اور اشاریہ قرطاس کراچی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا جو جون ۲۰۰۵ء تک کے شماروں کو محیط ہے۔ اسے ڈاکٹر سہیل شفیق نے ڈاکٹر سجاد ظہیر کی نگرانی میں تیار کیا ہے۔

ان اشاریوں کی مدد سے یہ معلوم کرنا آسان ہو گیا ہے کہ فلاں موضوع پر معارف میں کیا کچھ شائع ہوا ہے۔ مگر معارف کی تمام فائلیں ہر جگہ دستیاب نہیں، اور جہاں ہیں بھی تو یہ ضروری نہیں کہ وہاں سے مطلوبہ مضامین کا عکس بھی سہولت سے مل جائے۔ ایسی صورت میں قدیم رسالوں کے یہ اشاریے بیک وقت مسرت بخش بھی ہوتے ہیں اور اذیت ناک بھی۔ یہ ایک آگ بجھاتے ہیں اور دوسری اس سے شدید بھڑکاتے ہیں۔ ان کی مثال اس دسترخوان کی ہوتی ہے جس پر انواع واقسام کے لذیذ کھانوں کے نام تو درج ہوں جن سے آدمی کی اشتہا بڑھتی جاتی ہو مگر اصل کھانوں کو کا دور دور تک پتا نشان نہ ہو۔

دارالمصنّفین کے ذمہ داروں کو اس ضرورت کا احساس ہوا تو انھوں نے معارف کی مکمل فائل کو ڈیجیٹل صورت میں فراہم کرنے کا کام شروع کیا اور آخر کار ۱۹۱۶ء سے ۲۰۰۸ء تک کے شماروں کی سی ڈیز علامتی قیمت پر دستیاب ہو گئیں۔ معارف سے استفادے کے لیے یہ ایک عظیم پیش رفت تھی اور محققین اور طلبہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ دارالمصنّفین مالی وسائل کی جس قلت کا شکار تھا اس کی وجہ سے ممکن ہے ذمہ داران دارالمصنّفین کے پیش نظر یہ بھی رہا ہو کہ ہندوستانی جامعات کے مرکزی کتب خانے اور شعبہ جاتی لائبریریاں، اسی طرح جامعات کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر یہ سی ڈیز خریدیں گے اور دارالمصنّفین کو کچھ یافت ہو جائے گی۔ معلوم نہیں اس مقصد میں کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں، بہر حال قدیم رسائل میں معارف وہ پہلا رسالہ تھا جس نے محققین کے لیے یہ سہولت فراہم کی۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے جب دارالمصنّفین کا انتظام سنبھالا تو جہاں اس کی عمومی خستہ حالی اور ناتوانی کو دور کرنے کے لیے غیر معمولی فیصلے کیے، وہیں خاص معارف کے سلسلے میں بھی

بعض انقلابی اقدامات کیے جنہیں اس رسالے کی اولیات میں شمار کیا جائے گا۔ پہلے تو انہوں نے معارف کو آن لائن کر کے اسے انٹرنیٹ استعمال کرنے والے دنیا بھر کے اردوداں ناظرین کے لیے سرمۂ مفت نظر بنا دیا اور اس کا فائدہ خاص طور پر معارف کے بیرون ہند کے شیدائیوں کو پہنچا جنہیں ڈاک کی بدانتظامی یا دوسری رکاوٹوں کے سبب ہر ماہ پابندی سے معارف نہیں مل پاتا تھا۔ اور ابھی حال میں تو ظلی صاحب نے معارف کا پورا خزانہ محققین کی راہ میں بے دریغ لٹا دیا۔ اب معارف کی ویب سائٹ پر جانے کی دیر ہے، جو شمارہ آپ دیکھنا چاہیں سیکنڈوں میں اس کے صفحات آپ کی نظروں کے سامنے ہوں گے۔ معارف کی صد سالہ فائل میں علم و دانش کے جو گلشن آراستہ و پیراستہ اپنی بہار دکھار ہے ہیں، آپ جب چاہیں مکمل آزادی کے ساتھ ان کی سیر کر سکتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں تھک جائیں گی مگر ان کے بوقلموں مناظر ختم نہیں ہوں گے اور آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ

داماںِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

یہ بھی ایک اعجوبہ ہے کہ جو کام ہندو پاک کے سرکاری رسائل اور مادی وسائل سے مالا مال علمی مراکز اب تک نہ کر سکے تھے وہ دارالمصنّفین جیسے ادارے نے اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود کر دکھایا۔

ظلی صاحب نے دنیا بھر کے محققین اور عام ناظرین تک معارف کے تازہ شماروں کو سہل الحصول اور سریع الحصول بنانے کے لیے اور بھی اقدامات کیے ہیں جن کی تفصیل گزشتہ ستمبر کے شذرات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرات! تاریخ کے اس یادگار موڑ پر جب کہ ماہنامہ معارف نے ایک صدی کا سفر مکمل کر لیا ہے، اس کے شاندار ماضی کے ساتھ اس کا حال و مستقبل بھی آپ کی توجہ کا مستحق ہے۔ بلاشبہ یہ دارالمصنّفین کے بنیاد گزاروں، رفقا اور کارکنوں کا اخلاص و ایثار تھا، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم ادارے کو قائم رکھا اور انشاء اللہ یہ آئندہ بھی قائم رہے گا اور معارف بھی ہر ماہ نکلتا رہے گا۔ لیکن یہ دنیا دارالاسباب ہے اور دارالمصنّفین محض ایک دارالاشاعت اور معارف ایک عام رسالہ نہیں ہے۔ دارالمصنّفین کا مقصد اعلیٰ درجے کے مصنّفین پیدا کرنا اور ایک خاص منصوبے کے تحت مفید لٹریچر تیار کرنا ہے، اور معارف دارالمصنّفین

کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔معارف کو اپنے مقصد کے ساتھ مضامین کے اعلیٰ معیار اور اپنی انفرادیت کا تحفظ کرنا ہے۔اس وقت ایک طرف جدید وسائل نے مآخذ اور معلومات تک رسائی آسان کردی ہے اور ان سے استفادے کے نت نئے طریقے ایجاد کردیے ہیں تو دوسری طرف ہمارے یہاں سنجیدہ، دقیقہ رس اور پتے ماری کرنے اور دماغ کا تیل جلانے والے محققین جو پہلے بھی بہت زیادہ نہیں تھے اب کم سے کم ہوتے جارہے ہیں۔کم ہمتی اور تن آسانی عام ہے۔"کاتا اور لے دوڑی" پر عمل کرنے والے تو ہمیشہ ملتے رہیں گے کہ یہ جنس کبھی کمیاب نہیں تھی، مگر ایسے اہل علم جن کی تحریروں سے علم میں اضافہ ہوتا ہو اور موضوع کے مخفی گوشے سامنے آتے ہوں، اول تو ان کی تعداد کم ہے، دوسرے ان کے مضامین کے حقدار اور طلب گار برصغیر کے مختلف اداروں اور جامعات سے نکلنے والے بہت سے دوسرے علمی رسائل بھی ہوتے ہیں۔ایسی صورت میں معارف جیسے ماہانہ رسائل کے لیے اپنے معیار کو بلند کرنا تو درکنار، اسے برقرار رکھنا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں۔ایک زمانہ تھا کہ دارالمصنّفین کے فاضل رفقا بغیر کسی خارجی مدد کے پورا شمارہ مرتب کرسکتے تھے مگر موجودہ حالات میں یہ آسان نہیں۔

اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اعلیٰ درجے کے مضامین حاصل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ دارالمصنّفین میں باصلاحیت، سنجیدہ اور حوصلہ مند اسکالروں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور انہیں مضمون نویسی اور تصنیف وتالیف کی تربیت دینے کی ضرورت ہوگی۔دارالمصنّفین کے منتظمین اس بنیادی ضرورت سے یقیناً غافل نہیں ہوں گے لیکن اس کی تکمیل کا انحصار مادی وسائل کی فراہمی پر ہے، اور افسوس کہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل اب تک نہیں نکل سکا ہے۔دارالمصنّفین کے بہی خواہوں اور معارف کے قدردانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلے پر توجہ دیں اور اس کا کوئی پائدار حل تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ سید صاحب کے بقول "ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے"۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علامہ شبلی کا یہ چمن دائم سرسبز وشاداب رہے، علم وادب کی بہاریں یہاں ہمیشہ خیمہ زن رہیں اور ماہنامہ معارف کا فیضان اسی شان سے جاری رہے۔

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

نسخۂ حمیدیہ۔دریافت،گم شدگی،بازیافت

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

غالبؔ نے اگرچہ اپنے کلام میں جابجا اپنے بختِ خفتہ کا رونا رویا ہے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعرانہ شہرت وقبول کے لحاظ سے عموماً اور اپنے کلام کے نادرونایاب قلمی نسخوں کی اچانک دستیابی کے لحاظ سے خصوصاً نہایت بیدار بخت واقع ہوئے تھے۔اس سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۱۸ء میں مولانا عبدالسلام ندوی نے کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال میں غالبؔ کے قدیم مسترد دیوان مکتوبہ ۱۸۲۱ء کی موجودگی کا انکشاف کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہ نامہ معارف ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات کے ذریعے علمی وادبی حلقوں کو اس گوہرِ بے بہا سے مطلع کیا۔سید صاحب نے یہ اطلاع ان الفاظ میں دی تھی:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی ''شعرالہند'' کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔اس سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔وہاں کے کتب خانۂ حمیدیہ میں انہیں ایک انمول جواہر ملا،یعنی مرزا غالب کا اصلی مکمل اردو دیوان بلاحذف وانتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔نہایت عمدہ مُطلّا نسخہ ہے۔کسی خوش مذاق کے ہاتھ وہ پڑا تھا۔اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ بھی لکھ دیا ہے۔
>
> یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے۔موصوف آج کل دیوانِ غالب کی خدمت گذاری میں مصروف ہیں اور عن قریب ان کے نتائجِ فکر ترقی اردو کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئیں گے۔ہم نے ڈاکٹر صاحب

شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ۔

سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں''۔(۱)

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی اطلاع کے مطابق اس مخطوطے کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی میں سید ہاشمی فرید آبادی نے اسے خصوصی طور پر بھوپال آکر دیکھا تھا جس کا بیان ہاشمی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقیِ اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالب کی عمر صرف پچیس برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمۂ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالبؔ مرحوم ہی کا کلام ہے اور چونکہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں، تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا''۔(۲)

ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ نے اپنے ایک مضمون ''نسخۂ بھوپال۔ چند انکشافات'' میں یہ اہم اطلاعات بھی فراہم کی ہیں کہ کتب خانۂ حمیدیہ کے قدیم ریکارڈ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ:

''اس مخطوطے کو ڈاکٹر بجنوری نے حمیدیہ لائبریری سے ۴/اگست ۱۹۱۸ء کو مستعار لیا تھا۔ ان کے انتقال (۷ نومبر ۱۹۱۸ء) کے بعد سرکاری طور پر یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے لیے مفتی انوار الحق ڈائرکٹر تعلیمات کے پاس رہا اور پھر ۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر بجنوری ہی کے نام پر واپس کیا گیا۔ اس کے بعد ۳/نومبر ۱۹۲۷ء کو ماسٹر ولی محمد نے اس کو جیسا کہ دیگر حوالوں سے معلوم ہے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو حیدرآباد بھیجنے کے لیے کتب خانے سے اخذ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد ۲۱/جنوری ۱۹۲۸ء کو کتب خانے میں واپس کر دیا''۔(۳)

ڈاکٹر عبداللطیف کے بعد اس نسخے سے استفادہ کرنے والوں میں سب سے اہم نام پروفیسر حمید احمد خاں کا ہے۔ اس لیے یہاں ان کے بعض مشاہدات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مرتبہ ''دیوان غالب۔نسخۂ حمیدیہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ”مفتی انوار الحق کا نسخہ شائع ہوا تو یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مطبوعہ نسخہ قلمی نسخے کی صحیح نقل نہیں ہے۔ اس بارے میں شاید سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے نسخے میں کئی جگہ حاشیے کے اندراجات اور متن کے درمیان ضروری امتیاز قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ صحیح صورتِ حال کی دریافت کے لیے قلمی نسخے کا مطالعہ ضروری ہوگیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد دکن کے ایک سفر سے واپس لاہور آتے ہوئے بھوپال ٹھہر گیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ نہ رکھنے سے قطع نظر مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے لیے لازم ہوا کہ میں اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھوں، اول یہ کہ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب متعین کروں اور دوم یہ کہ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان جہاں جہاں اختلاف ہے اس کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لوں۔ افسوس ہے کہ وقت کی کوتاہی کے باعث میرے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ مخطوطے کے ہر شعر اور مصرع کو لفظ بہ لفظ دیکھ لیتا“۔(۴)

پروفیسر حمید احمد خاں کے بعد نامور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ۱۹۴۴ء میں مذکور الصدر نسخے کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ ”دیوان غالب، نسخہ عرشی“ کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”میں نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاس ناگپور (منعقدہ ۱۹۔۲۰۔۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء) سے واپسی میں خاص اس نسخے کو دیکھنے کے لیے بھوپال میں دو دن قیام کیا تھا۔ اس مختصر مدت میں اس گوہرِ بے بہا کی حالت بھی دیکھی اور جہاں تہاں سے اصل اور مطبوعہ نقل کا مقابلہ بھی کیا“۔(۵)

قلمی نسخے سے مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے تقابل کے بعد مولانا عرشی نے یہ رائے قائم کی کہ مفتی صاحب تصحیح کا حق ادا نہ کر سکے اور اس میں ہر طرح کی غلطیاں راہ پا گئیں۔ اس ضمن میں مولانا نے جس طرح کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ نسخۂ بھوپال کے بہت سے اشعار چھوڑ دیے ہیں۔ ۲۔ متداول دیوان میں شعر موجود

ہے،مگراس کااظہارنہیں کیا۔ ۳۔نسخۂ بھوپال کے حاشیے میں شعرموجود ہے،مگراس کا اظہارنہیں کیا۔
۴۔نسخۂ بھوپال کالفظ چھوڑ کرصرف متداول لفظ نقل کیا۔ ۵۔نسخۂ بھوپال میں شعرنہیں ہےاور پھر بھی اسےنسخۂ بھوپال کاظاہرکیاہے۔ ۶۔محل اصلاح غلط بتایاہے۔ ۷۔نسخۂ بھوپال کی صحیح قرأت کوغلط چھاپ دیاہے۔ ۸۔متداول قرأت کچھ ہےاور چھاپ کچھ دی گئی ہے۔۹۔کاپی نویس کی غلطیوں کی اصلاح نہیں ہوسکی ہے۔(۶)

جنوری ۱۹۴۴ء کے بعد کسی نے اس نسخے کا مطالعہ کیاہو، اس کا کوئی ذکرنہیں ملتا۔ البتہ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں انضمام ریاست بھوپال کے بعداس کی گم شدگی کی اطلاع ملتی ہے۔ چنانچہ مولانا عرشی لکھتے ہیں:

"ریاست بھوپال کے ہندوستان میں انضمام کے بعد یہ گوہر بے بہا کتب خانۂ حمیدیہ سے گم ہوگیا۔ میں نے جب اس کے متعلق لائبریرین سے خط لکھ کر دریافت کیا توانہوں نے بتایا کہ حمیداللہ خاں صاحب نواب بھوپال نے انضمام سے پہلے اسے اپنے پاس طلب کرلیا تھا۔خودنواب صاحب مرحوم سے جناب آصف فیضی کی معرفت معلوم کیاتو انہوں نے فرمایا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ نسخہ کتب خانے سے غائب ہوگیا"۔(۷)

اسی طرح اس نسخے کی بابت ایک استفسار کے جواب میں مولانا عرشی نے اپنے مکتوب مورخہ ۸ مارچ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹرابومحمدسحرکولکھا:

"نواب صاحب مرحوم سے میں نے ان کے ایک دوست کے ذریعے معلوم کرایا تھاتوانہوں نے اس نسخے کے اپنے پاس ہونے سے انکارکردیا تھااور یہ فرمایا تھا کہ خود میراعلم بھی یہی ہے کہ مَرجَر کی افراتفری میں کسی نے وہاں سے پارکردیا۔اب اللہ جانے کہ وہاں سے کہاں گیا۔ وہاں کے لائبریرین نے لکھا تھا کہ نواب صاحب نے منگالیا تھا۔ اگراس کا کہیں پتہ چل جائے تو مجھے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ مجھے اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔اگروہ مل جائےتوبہت سے الفاظ کی تعیین کرسکوں گا"۔(۸)

ڈاکٹرابومحمدسحرنے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پرحمیدیہ کالج، بھوپال میں اپنے رفیق کارسیدحامدحسین کےساتھ اس کی تلاش کاایک سنجیدہ منصوبہ بنایا۔اس مشترکہ چھان بین کے نتیجے میں

انہیں معلوم ہوا کہ نسخۂ بھوپال دیگر نادر مخطوطات کے ساتھ حمیدیہ لائبریری میں الماری نمبر ۴۷ میں رکھا ہوا تھا اور جہاں تک مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال میں جائزہ لیا جاسکا ان میں سے اب کوئی مخطوطہ اس لائبریری میں موجود نہیں۔ اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

> ''چونکہ اس سارے ذخیرے کے گم ہونے یا تلف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہ زبانی روایت پہلے سے موجود ہے کہ ''نادرات'' نواب صاحب مرحوم نے حمیدیہ لائبریری سے واپس لے لیے تھے۔ اس لیے راقم الحروف کی ناقص رائے میں نسخۂ بھوپال کے گم یا تلف ہونے کا قیاس جس نسبت سے کم زور ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ مخطوطہ یا تو نواب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے یا انہیں کے توسط سے کسی اور کے قبضے میں چلا گیا''۔(۹)

نسخہ بھوپال کو دوبارہ دریافت کرنے کی تمام کوششوں کی ناکامی کے باوجود ڈاکٹر ابومحمد سحر مرحوم نے لکھا تھا:

> ''اگر یہ مخطوطہ تلف نہیں ہوگیا ہے تو اس طویل وعریض دنیا میں کسی فرد یا ادارے کے پاس سے کبھی نہ کبھی ضرور برآمد ہوگا۔ لیکن فی الحال اس کی حیثیت ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کے ایک گلدستے سے زیادہ نہیں''۔(۱۰)

ڈاکٹر ابومحمد سحر کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ۲۰۱۵ء میں اس گم شدہ نسخے کی بازیافت ہوگئی۔ اس بازیافت کا سہرا اولاً شہاب ستار اور ثانیاً ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی کے سر جاتا ہے۔ مہر اس نسخے پر اپنے تعارف میں لکھتی ہیں:

> ''یہ نسخہ مجھے شہاب ستار کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ شہاب نے اسے لندن میں نایاب کتابوں کے ایک بیوپاری سے حاصل کیا تھا''۔

اس مخطوطے پر مہر افشاں کا تعارف مفصل اور مبسوط ہے۔ انہوں نے متعدد اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے حل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مخطوطے کو اس کی اصل شکل میں شائع کرادیا ہے۔

شہاب ستار نے اصل مخطوطے کی ڈیجیٹل شکل تیار کی ہے۔ وہ اس نسخے پر اپنے پیش لفظ

میں لکھتے ہیں:

"ایک مجلد مخطوطے سے ڈیجیٹل کاپی تیار کرنا تکنیکی طور پر آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس بات کی پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ مخطوطے کو جس حد تک ممکن ہو، اس کی اصل شکل وشباہت، جسامت اور حالت میں پیش کیا جائے۔ ہم نے جان بوجھ کر مخطوطے کے اندر پائی جانے والی کتنی خرابیوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خوش قسمتی سے یہ مخطوطہ ہر طرح کے حالات سے گذر کر ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں"۔

(شہاب ستار، ڈھاکہ، اکتوبر ۲۰۱۵ء)

راقم کو اس مخطوطے کا ڈیجیٹل شکل میں شائع شدہ ایک نسخہ ۲۰/مارچ ۲۰۱۶ء کو ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی کی عنایت سے قیمتاً حاصل ہوا ہے۔ میں نے اس مخطوطے کی ابتدائی پانچ غزلوں کا تقابلی مطالعہ مفتی انوار الحق، پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی کے مطبوعہ متون سے کیا ہے۔ آیندہ صفحات میں اس سے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

مخطوطے کی پہلی غزل کا مطلع نہایت مشہور ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اصل نسخے میں یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں کا متن اور اشعار کی ترتیب اصل کے مطابق ہے۔ مولانا عرشی نے "گنجینۂ معنی" میں صرف چار متروک شعر نقل کیے ہیں۔ اس غزل کا مقطع اس طرح ہے:

وحشتِ خواب عدم شورِ تماشا ہے اسدؔ　　جو مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اصل مخطوطے میں مصرعِ ثانی کا پہلا لفظ 'جو' ہے۔ تینوں مرتبین دیوان غالب نے بھی 'جو' ہی لکھا ہے۔ لیکن بیاضِ غالب بخط غالب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صحیح لفظ 'جز' ہے اور 'جو' سہو کاتب ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ صحیح لفظ کی طرف مولانا عرشی کا ذہن بھی منتقل نہ ہو سکا۔ قلمی نسخے میں چھ اشعار پر مشتمل دوسری غزل کا مطلع اس طرح ہے:

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا　　سویدا تا بہ لب زنجیریِ دودِ سپند آیا

اس شعر کے مصرعِ ثانی میں غلط قرأت کے سبب مفتی انوار نے 'زنجیری' کو 'زنجیر سے' لکھ دیا

ہے۔ پروفیسر حمید نے بھی اس غلطی کی پیروی کی ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے اصل کے مطابق صحیح لفظ 'زنجیری' لکھا ہے۔اس غزل کا پانچواں شعر اصل نسخے میں اس طرح ہے:

عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی خرامِ ناز ، برقِ خرمنِ سعی سپند آیا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بھی غلط قرأت کے سبب مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں نے 'سعی سپند' کو 'سعیِ پسند' لکھ دیا ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے اصل کے مطابق صحیح متن کا اندراج کیا ہے۔ قلمی نسخے کے مطابق تیسری غزل کا مطلع ہے:

عالم جہاں بہ عرضِ بساطِ وجود تھا جوں صبح چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

اصلاً یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ مفتی انوار کے مرتبہ دیوان میں اس غزل کا تیسرا شعر شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ پروفیسر حمید نے بھی انہیں کی پیروی کی ہے۔ البتہ مولانا عرشی کے یہاں یہ شعر موجود ہے جو اس طرح ہے:

عالم طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سربسر یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا

چوتھی غزل چھے اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بت مشکل پسند آیا تماشائے بہ یک کف برونِ صد دل پسند آیا

اس غزل کا چوتھا شعر اصل میں اس طرح ہے:

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی برنگِ لالہ جامِ بادہ پر محمل پسند آیا

اس شعر کے مصرعِ ثانی میں بھی غلط قرأت کے سبب مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں نے 'پُر' کو 'بُر' لکھ دیا ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے یہاں بھی صحیح متن یعنی 'پُر' لکھا ہے۔ پانچویں غزل سات اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا مطلع حسب ذیل ہے:

تنگیِ رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

اس غزل کا مقطع اس طرح ہے:

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ سر تا قدم گذارشِ ذوقِ سجود تھا

مفتی انوار، پروفیسر حمید اور مولانا عرشی تینوں نے اس شعر کے مصرعِ ثانی میں لفظ "گزارش" 'ز' سے لکھا ہے۔ حالانکہ اصل قلمی نسخے میں یہ لفظ 'ذال' سے لکھا ہوا ہے۔ مفتی انوار اور مولانا عرشی دونوں کا

خیال ہے کہ زیر بحث نسخہ غالبؔ کے لیے لکھا گیا تھا یا ان کی نگاہ سے ایک سے زائد بار گزرا تھا۔اس لیے اس نسخے میں 'گذارش' کا ذال سے لکھا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس نسخے کے سالِ کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ تک غالبؔ نے فارسی الفاظ میں ذال کے انکار کا موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ان حقائق کے پیش نظر بہتر یہی تھا کہ اس شعر میں 'گذارش' کو اصل کے مطابق ذال سے لکھا جاتا۔واضح رہے کہ اس مخطوطے میں نیز بیاض غالب بخط غالب میں ''گذشتن'' اور اس کے مشتقات کو بھی ہر جگہ ذال ہی سے لکھا گیا ہے۔اس سے بھی ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

نگاہ دیدۂ نقش قدم ہے جادۂ راہ گذشتگاں اثرِ انتظار رکھتے ہیں

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گذشتن ہے کہ یہاں ہر یک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

حاصل کلام یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی باز یافت اور اصل شکل میں اس کی اشاعت ہمارے عہد کا ایک عظیم الشان ادبی واقعہ ہے۔اس سے مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح میں مدد ملے گی اور غالبؔ کے غیر متداول کلام سے متعلق بحث و تمحیص کے نئے دروازے کھلیں گے۔

آخر میں اہل علم کو اس طرف متوجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد نظم طباطبائی نے اپنے ایک شاگرد عبدالرزاق راشد کی درخواست پر ''اصلاحات غالب'' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔اس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ غالب نے اپنے اشعار میں جو ردو بدل کیا ہے اور دیوان سے جو اشعار خارج کیے ہیں تو اس کی وجوہ کیا ہیں؟ اس کتاب کی اشاعت طباطبائی کی وفات کے بعد ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ذیل میں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔غالب نے اپنے دیوان کی پہلی غزل میں ایک شعر اس طرح کہا تھا:

آتشیں پا ہوں گداز وحشتِ زنداں نہ پوچھ موے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یہاں زنجیر کا

بعد میں ردو بدل کر کے اسے انہوں نے یوں کر دیا:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اس اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے طباطبائی لکھتے ہیں:

''آتشیں پا اور آتش زیر پا کا ایک ہی مطلب ہے۔ان میں کا ایک لفظ حلقہ

زنجیر کو موئے آتش دیدہ بنانے کے لیے کافی تھا۔ پھر گدازِ وحشت زنداں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس سے معنی میں الجھن پیدا ہوگئی تھی کہ آیا حلقۂ زنجیر کو آتشیں پا ہونے سے موئے آتش دیدہ کا وصف حاصل ہوا ہے یا گدازِ وحشت کے سبب سے۔ مصنف نے گدازِ وحشت کو نکال ڈالا۔ اب مطلب صاف ہوگیا''۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کا غیر متداول بھی کیسا لائق توجہ ہے۔

حواشی

(۱) ماہ نامہ معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۔ (۲) غالبیات کے چند مباحث، ص ۶۵، بہ حوالہ دیوان غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) تبصرہ از سید ہاشمی، اردو سہ ماہی، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔ (۳) غالبیات چند مباحث، ص ۹۱۔ ۹۲۔ (۴) مقدمہ ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، ص ۲۰۔ ۲۱۔ (۵) مقدمہ دیوان غالب نسخۂ عرشی، طبع دوم، ص ۸۶۔ (۶) بحوالۂ بالا، ص ۴۹۔ ۵۰۔ (۷) ایضاً، ص ۹۲۔ (۸) غالبیات چند مباحث، ص ۶۴۔ (۹) ایضاً، ص ۸۷۔ ۹۳۔ (۱۰) بحوالۂ بالا، ص ۶۴۔

کتابیں

۱۔ اصلاحاتِ غالب، نظم طباطبائی، مرتبہ عبدالرزاق راشد، اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء۔

۲۔ بیاض غالب بخط غالب، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مشمولہ نقوش، غالب نمبر (حصہ دوم)، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۳۔ دیوان غالب جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) مرتبہ مفتی محمد انوار الحق، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، طبع دوم: عکسی، ۱۹۸۲ء۔

۴۔ دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ، پروفیسر حمید احمد خاں، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم: جون ۱۹۹۲ء۔

۵۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی، طبع دوم: ۱۹۸۲ء۔

۶۔ غالبیات کے چند مباحث، ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ (مصنف) نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، طبع اول: مئی ۱۹۸۲ء۔

۷۔ نسخۂ حمیدیہ (اصل مخطوطہ دیوان کی ڈیجیٹل شکل) مع تعارف از مہر افشاں فاروقی، پیش لفظ، شہاب ستار (مورخہ اکتوبر ۲۰۱۵ء) سنہ و مطبع ندارد۔

رسالہ

۱۔ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء (شذرات، سید سلیمان ندوی)

روداد

معارف صدی سمینار

کلیم صفات اصلاحی

معارف کا خاکہ علامہ شبلی نے تیار کیا اور اس میں رنگ ان کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے بھرا۔ اس کا پہلا شمارہ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ جولائی ۱۹۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ پہلے شمارہ کے شذرات میں سید صاحب نے استاد علیہ الرحمہ کی منشا کے مطابق اس کے مقاصد و اغراض اشاعت کی تفصیل پیش کی اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنی علمی لیاقت، تصنیفی صلاحیت، ادارتی سلیقہ مندی اور اعلیٰ صحافتی ذوق کے سبب معارف کو اردو دنیا کا منفرد اور بے نظیر رسالہ بنا دیا اور پورے برصغیر کے ممتاز ترین علما و فضلا اور ادبا کی مجلسوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

سید صاحب نے اس کے ذریعہ "دین کی راہ سے علم کی اور علم کی راہ سے دین کی خدمت" کی روایت قائم کی، ملک کو متین و سنجیدہ لٹریچر فراہم کیا اور اس کی تحقیقی و ادبی فضا کا رخ موڑا، ملت کی نسلِ نو کو اپنے شاندار ماضی سے رشتہ استوار کرنے کی ترغیب دی اور اس کی ذہن سازی اور فکری بیداری کا فریضہ بھی ادا کیا۔ تعلیم و تعلم، علوم و فنون سے شغف اور جدید تقاضوں سے آشنائی کا ذوق پیدا کیا اور ساتھ ہی ایسے لائق و فائق افراد تیار کیے جو ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر معارف کو نہ صرف ایک رسالہ بلکہ علم و فن اور فکر و تحقیق کی پرزور اور مفید تحریک کی شکل میں آگے لے جانے کا فریضہ ادا کریں اور الحمد للہ اہل علم نے دیکھا کہ معارف نے دنیائے صحافت میں کیسا انقلاب برپا کیا اور جو چراغ شبلی و سلیماں نے روشن کیا تھا، نہ جانے کتنے گھروں کو اس سے روشنی ملی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول:

> "اس شمع نے ملت کے کتنے اندھیرے گھروں میں اجالا پھیلا دیا اور پھر
> اسی ایک چراغ سے کتنے اور چراغ جلائے گئے"۔

رفیق دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

نہایت نامساعد حالات کے باوجود ایک صدی سے علم و تحقیق اور فکر و فن کی اس شمع کا پوری آب و تاب کے ساتھ ضوفشاں رہنا اپنے آپ میں ایک عجیب و غریب اور تاریخ ساز واقعہ ہے اور اردو دنیائے صحافت اس پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ یہ بلاشبہہ محض اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کے اس اہم اور عظیم موڑ پر جس کی حیثیت یقیناً سنگ میل کی ہوگئی ہے، یہ خواہش بیجا نہیں کہ معارف صدی تقریبات کا اہتمام معارف کے شایانِ شان کیا جائے۔ چنانچہ اس مناسبت سے مدیر معارف نے بہت پہلے ہی سے معارف کے قدردانوں کو اس کی طرف متوجہ کرانا شروع کر دیا تھا۔ یہی نہیں اکیڈمی کے وسائل جس حد تک اجازت دیتے تھے اس سلسلہ میں عملی اقدامات بھی کیے گئے اور قارئین معارف کو ان سے آگاہ بھی کیا جاتا رہا مثلاً محققین کی سہولت کی خاطر معارف کی سو سال کی مکمل فائل کو ویب سائٹ پر دستیاب کرانا، گزشتہ سو سال کے پورے معارف کی ڈی وی ڈی، پی ڈی ایف فارمیٹ میں فراہم کرنا، پریس ریڈر کے پلیٹ فارم تک اس کو پہنچانا، موبائل پر ٹکسٹ، ایپ اور مووی فارمیٹ میں اس کو ہر مہینہ قارئین کے لیے دستیاب کرانا اور اس کی توسیع اشاعت کے لیے تجویزیں شائع کرنا۔ اس سلسلہ کا سب سے اہم منصوبہ معارف کی غیر معمولی اور بے نظیر علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی، تاریخی خدمات، اس کی اولیات و امتیازات اور اردو صحافت پر اس کے اثرات کے جائزہ و تجزیہ کے مقصد سے دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد تھا جو الحمدللہ ۲۰-۲۱/ مارچ ۲۰۱۷ء کو "معارف صدی سمینار" کے عنوان سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد کیا گیا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ معارف نے اپنے قدردانوں اور محبان اردو سے بجا طور پر یہ توقع کی تھی کہ اس عدیم المثال واقعہ کے ظہور پر ان کی جانب سے متعدد علمی مذاکرات، معارف کی علمی، تنقیدی، تحقیقی خدمات پر تصنیفات و مقالات کی اشاعت، علمی و ادبی جرائد میں اس کی دیرینہ انقلابی صحافت کا چرچا اور ملک بھر میں اس کی حصولیابیوں پر جشن کا اہتمام کیا جائے گا۔ تاہم یہ امید "امید موہوم" ثابت ہوئی اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود صرف نجیب آباد کے معارف شناس احباب نے "معارف کا سو سالہ سفر۔ اردو صحافت کا سنگ میل" کے نام سے ایک جشن کا اہتمام کیا جس کی مختصر روداد ان ہی صفحات میں قارئین معارف پڑھ چکے ہیں اور اس موضوع پر صرف چند مضامین اور مقالات شائع ہوئے۔ اس "سرد مہری اور بے توجہی" کے باوجود معارف نے صلہ و ستائش کی پروا

کیے بغیر پوری توانائی کے ساتھ الحمدللہ اگلی صدی کے سفر کے لیے کمر ہمت کس لی ہے اور انشاء اللہ آیندہ بھی اس کا سلسلۂ فیض رسانی جاری رہے گا۔

معارف نے جون ۲۰۱۶ء کے شمارے پر اپنی زندگی کی ایک صدی مکمل کی۔ اس موقع پر یادگار کے طور پر جون اور جولائی ۲۰۱۶ء کے دونوں شماروں کو خاص نمبر کی شکل میں قدردانوں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ معارف صدی تقریبات کے قیمتی تحائف میں ایک بیش قیمت تحفہ یہ خصوصی نمبر ہے اور اسی سے گویا اس کا حسن آغاز ہوا تو شاید بے جا نہ ہو۔ ابتداءً معارف صدی سمینار نومبر میں منعقد کرنے کا پروگرام تھا لیکن بوجوہ یہ ممکن نہ ہوا۔ ۲۷-۲۶/فروری ۲۰۱۷ء کا اعلان کردیا گیا اور دعوت نامے بھی جاری کردیے گئے لیکن یوپی کے الیکشن کی وجہ سے اس کو بھی بدلنا پڑا۔ بالآخر ۲۱-۲۰/مارچ کو اس کا انعقاد ہوا۔ تاریخوں کی اس تبدیلی کا اثر سمینار پر پڑنا فطری تھا اور بہت سے اہم مقالہ نگار خواہش کے باوجود شریک نہ ہوسکے۔

اس سمینار میں کل سات اجلاس منعقد ہوئے، افتتاحی اجلاس ۲۰/مارچ کی صبح ساڑھے نو بجے شروع ہوا اور ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہا۔ اس کی صدارت مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر اور رسالہ اردو ''سائنس'' کے مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے انجام دیا۔ ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا۔

ناظم اجلاس نے اس صدی سمینار کی قدر و قیمت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رسالہ معارف نے اپنے سو سال پورے کیے اور یہ سو سال پورے ہونے کی خوشی کا موقع ہے اور اس سے بھی بڑھ کر گذشتہ صدی کو پیچھے مڑکر دیکھنے اور اس کے بعد اگلی صدی کے لیے اپنی ترجیحات کو متعین کرنے کا بھی وقت ہے۔ یہ تاریخی موڑ اور اس موقع پر یہاں آپ کی موجودگی ایک شہادت اور ایک گواہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مہمانوں کا بالاختصار تعارف کرایا۔ تعارف کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ڈائریکٹر شبلی اکیڈمی اور مدیر معارف کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرنے کی دعوت دی۔

پروفیسر ظلی صاحب نے خطاب کے آغاز میں ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک صاحب ہارورڈ

یونیورسٹی میں مطالعہ کے لیے تشریف لے گئے تو لائبریرین نے ان سے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں، انہوں نے کہا اعظم گڑھ سے، لائبریرین نے کہا وہی اعظم گڑھ جہاں سے رسالہ معارف نکلتا ہے۔ معارف دراصل ایک رسالہ نہیں، ایک روایت ہے۔ ایک تاریخ ہے۔ ایک بیش بہا خزینہ ہے جس کا خواب علامہ شبلی نے دیکھا تھا اور جس کی تکمیل ان کے تلمیذ رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہاتھوں ہوئی۔ رسالے تو بہت سے نکلے اور نکل رہے ہیں لیکن ان میں کوئی معارف نہیں ہے۔ رسالوں کے اپنے اختصاص ہوتے ہیں اور وہ اپنے اختصاص کے دائرہ میں ہی کام کرتے ہیں لیکن معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کا اختصاص تحقیق، تنقید، علم، دانش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس میں تقریباً ہر موضوع پر مضامین ملیں گے۔ وہ کون سا موضوع ہے جس کو آپ ذہن میں سوچیں اور معارف کے ایک لاکھ سے زیادہ صفحات میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ نہ مل جائے، یہ ہمہ جہت امتیاز اردو دنیا کے کسی دوسرے رسالہ کو حاصل نہیں۔ اس کے بعد ظلی صاحب نے اپنے مہمانوں اور مندوبین کے استقبال میں چند کلمات کہنے کے ساتھ ساتھ صدر مجلس ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اور ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا جامع تعارف بھی کرایا۔

اس کے بعد معروف محقق ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب کو کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے وقت کی قلت کے سبب اپنے مفصل، پرمغز اور معرکہ آرا خطبہ کے اہم اور ضروری اقتباسات حاضرین کو پڑھ کر سنائے، جس نے حاضرین کی آتش شوق کو مزید بڑھا دیا۔ ڈاکٹر اصلاحی نے فرمایا کہ شبلی اکیڈمی نے ایک صدی کا سفر مکمل کیا۔ اس کے بعد اس کے ترجمان رسالہ ”معارف“ نے بھی سو سال کا سفر طے کیا۔ معارف کے شایان شان صدی تقریبات کا انعقاد کر کے دارالمصنّفین نے قدردانی کی ایک عظیم روایت قائم کی ہے۔ انہوں نے معارف کی انفرادی شان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پورے عالم اسلام میں شاید ہی کوئی ایسا علمی اور تحقیقی مجلہ ہو جو سو سال تک بلاانقطاع علم وادب کے افق پر طلوع ہوتا رہا ہو۔ معارف کے وجود میں مدیر الندوہ علامہ شبلی کی تحریک و تائید اور اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ الندوہ کے جن مضامین نے مسلمانوں کا جمود توڑا اور ان میں حرکت پیدا کی تھی، وہ علامہ شبلی کے قلم سے نکلے تھے۔ معارف اسی کا نقش ثانی ہے۔ معارف کے مشمولات اور اس کے شذرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مقالات کا حصہ معارف کی جان ہے اور شذرات اس کا

دیباچہ لیکن کئی پہلوؤں سے شذرات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ الندوہ اور معارف کے مدیروں کے طرز تربیت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح شبلی نے الندوہ کے ذریعہ لکھنے والوں کی ٹیم تیار کی، مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف کے ذریعہ بھی ایسی ٹیم تیار کی۔ معارف کے امتیاز اور تنوع کے متعلق کہا کہ اس کے توسط سے نہ جانے کتنے لکھنے والوں کو علمی دنیا میں شہرت ملی، معارف میں مقالات کا تنوع قابل دید ہے، ایسا تنوع اسلامیات کے کسی اور رسالہ میں مشکل سے ملے گا۔ معارف کی حیثیت دائرۃ المعارف کی ہے۔ اس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کو جس پائے کے مدیر ملے وہ شاید ہی کسی اور رسالہ کو ملے ہوں۔ مدیروں کے علاوہ انہوں نے معارف کے ممتاز ترین مقالہ نگار علما، ادبا، شعراء اور رفقا کی خدمات معارف کا بھی مختصراً ذکر کیا۔ آخر میں معارف کے سامنے چیلنجز بالخصوص اس کے قدیم مقالہ نگاروں اور اس کے گذشتہ معیار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ معارف کو اپنے مقصد کے ساتھ مضامین کے اعلیٰ معیار اور انفرادیت کا تحفظ کرنا ہے۔ اس وقت سنجیدہ، دقیقہ رس اور دماغ کا تیل جلانے والے محققین جو پہلے بھی بہت زیادہ نہیں تھے، کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں معارف جیسے ماہانہ رسائل کو اپنے معیار کو باقی رکھنا تو درکنار اس کو برقرار رکھنا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ موقع کی مناسبت سے معارف کے معیار و وقار کو باقی رکھنے کے لیے ممتاز اہل علم سے مقالات لکھنے کی درخواست پر زور دیا اور بعض دوسری اہم تجاویز بھی پیش کیں۔

اس کے بعد صدر اجلاس نے صدارتی خطاب میں کہا کہ میری خوش بختی ہے کہ میں اعظم گڑھ آیا اور شبلی منزل میں آیا۔ جہاں تک معارف کی بات ہے تو اس کے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ پچھلے سو سال میں اس نے سماج کے لیے کیا کچھ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محققین کے لیے بہت بڑا موضوع ہے۔ معارف کا یہ سفر کس قدر سخت رہا ہوگا، مجھے ایک رسالہ کے مدیر ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ ذاتی طور پر ہے۔ معارف کے علم و دانش اور سماج سے اس کے رشتوں کے متعلق کہا کہ معارف نے علم و دانش کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی زندگی کی ایک نئی جہت دی ہے۔ یہ فکر و فن اور علم و تحقیق پر مشتمل معلومات کا خزانہ بھی ہے اور تربیت کا ذریعہ بھی۔ انہوں نے اعظم گڑھ کے مدارس اور عصری جامعات کا حال سننے اور بعض کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا کہ علم و فضل کے اعتبار سے اعظم گڑھ جس ممتاز درجہ پر فائز ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ مدارس و جامعات کی کثرت کے لحاظ سے یہ ہندوستان

کا ''بوسٹن'' ہے۔ ہماری یونیورسٹی مدارس کو عصری اداروں سے جوڑنا چاہتی ہے۔ آخر میں انہوں نے شبلی اکیڈمی کے ذمہ داروں کو معارف صدی سمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی اور اس کے بہتر نتائج کی امید ظاہر کی۔ اس موقع پر مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، جامعۃ الرشاد اور شبلی کالج کے اساتذہ اور شہر و اطراف شہر کے صاحبان علم و دانش موجود تھے۔

۱۵ رمنٹ کے وقفہ چائے کے بعد ساڑھے گیارہ بجے مقالات کی پہلی نشست ہوئی۔ اس کی صدارت پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ اس میں ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے ''معارف کی منظوم وفیات'' شاہ نواز فیاض نے ''معارف کے لسانی مباحث''، ڈاکٹر عبدالقدوس نے ''شذرات سلیمانی کی عصری معنویت''، مولانا اشہد جمال ندوی نے ''معارف کا تفسیری ذخیرہ۔ ایک مطالعہ''، ڈاکٹر محمد رشید اشرف نے ''اردو رسائل میں معارف کی انفرادیت''، ڈاکٹر عطا خورشید نے ''معارف کے اشاریے''، پروفیسر علیم اشرف خان نے ''فارسی زبان و ادب کی ترویج میں معارف کا حصہ'' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی صدارتی تقریر پر یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

مقالات کی دوسری نشست شام ساڑھے چھ بجے سے پونے نو بجے تک ہوئی۔ اس کی صدارت پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور نظامت مولانا اشہد جمال ندوی نے کی۔ اس میں مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی نے ''معارف اور فراہیات''، ڈاکٹر محمد محامد نے ''معارف کے بعض اہم مقالہ نگار''، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے ''تعلیم کی بیداری میں معارف کا کردار''، ڈاکٹر علاء الدین خاں نے ''معارف اور تاریخ ہند''، مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے ''معارف اور مولانا سید سلیمان ندوی''، پروفیسر خالد محمود نے ''معارف اور غالبیات''، پروفیسر احمد محفوظ نے ''رسالہ معارف میں قدیم اردو شعراء پر مقالات کا جائزہ''، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے ''سیرت نبویؐ اور معارف'' کے عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے صدارتی خطاب پر یہ مجلس ختم ہوئی۔

مقالات کا تیسرا اجلاس ۹ ربجے شروع ہوا اور ساڑھے دس تک جاری رہا۔ اس کی صدارت پروفیسر خالد محمود اور نظامت ڈاکٹر احسان اللہ فہد نے کی۔ اس میں مولانا نسیم ظہیر اصلاحی نے ''معارف اور علم حدیث'' پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے ''معارف اور قاضی عبدالودود'' ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ''معارف اور اقبال'' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ صدر اجلاس کے صدارتی خطاب پر اس مجلس

کا اختتام عمل میں آیا۔

مقالات کا چوتھا سیشن ۲۱/ مارچ کی صبح ساڑھے نو سے شروع ہو کر ساڑھے گیارہ بجے تک چلا۔ اس کی صدارت پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی اور نظامت ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے کی۔ اس میں راقم نے ''مولانا ضیاء الدین اصلاحی بحیثیت مدیر معارف''، سلمان فیصل نے ''اردو کا مسئلہ اور معارف کے شذرات''، ڈاکٹر عمیر منظر نے ''ماہنامہ معارف اور تعلیمی ادارے''، مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے ''معارف اور اس کے قدرداں: معارف میں شائع شدہ خطوط کی روشنی میں''، پروفیسر سید سراج اجملی نے ''معارف اور الٰہ آباد''، پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''مولانا حبیب الرحمٰن اور رسالہ معارف'' کے موضوع پر مقالات پڑھے۔ آخر میں صدر اجلاس نے مقالات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

وقفہ چائے کے بعد مقالات کا آخری اجلاس ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوا اور یہ ایک بجے ختم ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ اور نظامت سلمان فیصل نے کی، اس میں مولانا فرمان احمد ندوی نے ''معارف اور علم حدیث''، مولوی محمد اسماعیل اصلاحی نے ''ہندوستانی مذاہب اور معارف''، مولوی محمد معصوم سلفی ندوی نے ''معارف اور فقہ اسلامی''، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے ''معارف کے تنقیدی مضامین''، ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی نے ''ماہنامہ معارف اور مولانا مودودی''، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے ''معارف اور علوم القرآن'' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ صدر اجلاس کے تاثراتی خطاب پر یہ مجلس ختم ہوئی۔

اختتامی اجلاس ایک بجے شروع ہوا۔ اس کی صدارت پروفیسر خالد محمود اور نظامت مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے کی۔ تاثرات کے لیے سب سے پہلے پروفیسر سید سراج الدین اجملی کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ بوجوہ میں تاخیر سے حاضر ہوا، لیکن حاضری کے بعد سے اب تک جو تجربات حاصل ہوئے وہ بہت خوش کن ہیں۔ امید بھی یہی تھی کہ اور جگہوں کی بہ نسبت دارالمصنّفین اور اس کے سمینار سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ بہت مختلف، منفرد اور قیمتی ہوگا۔ جس معیار کے مقالات یہاں سننے کو ملے ۸۰/ ۸۵ فیصد ایسے تھے جو بلاشبہہ ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب بنے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کہا کہ اس موقع کی مناسبت سے یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میرا سب سے پہلا غائبانہ تعارف دارالمصنّفین سے بارہ سال کی عمر میں ہوا۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۶۵ء سے مسلسل

یہاں حاضری ہوتی رہی۔اس ادارہ اور یہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کا سلسلہ بھی اسی زمانہ سے جاری رہا۔معارف بچپن سے ہی ہمارے گھر آتا تھا اور نہ سمجھنے کے باوجود اسے دیکھتا رہتا تھا۔اس زمانہ میں حسرت سے سوچتا تھا کہ کیا کبھی معارف میں میری کوئی تحریر چھپ سکے گی۔پھر علامہ شبلی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور ان پر تحقیق شروع کی تو دارالمصنفین سے رابطہ مزید استوار ہوا۔

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے کہا کہ دارالمصنّفین سے میرا علمی وقلبی تعلق بہت پہلے قائم ہوا۔ ندوہ میں طالب علمی کے دوران سب سے پہلے شبلی سے اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی سے تعلق قائم ہوا اور ان دونوں کی محبتوں نے معارف سے تعارف کرایا۔اور یہ تعلق اتنا مستحکم ہوا کہ ہر مہینہ معارف کا پڑھنا لازم ہوگیا۔شبلی سے شروع سے متاثر تھا اور سید سلیمان ندوی کو سمجھا بہت کم لیکن دھیرے دھیرے ان کو پڑھتا رہا۔اسی زمانہ میں مولانا ماجد دریابادی کا مضمون شبلی مصنف، مصنف گر پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ مصنف گر ہی نہیں بلکہ آدم گر بھی تھے۔سیرت نبویؐ پر کام کرنے کا سلیقہ، رہنمائی اور قدم قدم پر آج بھی رہنمائی شبلی کا فیضان ہے۔معارف کو پڑھنا شروع کیا تو شذرات پڑھ کر عش عش کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ شذرات میں جو اسلوب و زبان استعمال ہوتی تھی کبھی ایسا ہوگا کہ میں بھی ایسا لکھ پاؤں گا۔چنانچہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی خورد نوازی اور وسعت ذہنی نے مجھ کو معارف کے مقالہ نگاروں کی صف میں شامل کرادیا۔ جہاں تک معارف صدی سمینار کے مقالات کی بات ہے تو اس سلسلہ میں میرا مشورہ ہے کہ مضامین باقاعدہ ایڈٹ کر کے شائع کیے جائیں۔تمہیدیں نکال دی جائیں اور اس میں مدد کے لیے میں تیار ہوں۔مقالات بہت خوبصورت ہیں ۔ میں تو پروگرام کاپی میں چھپے عناوین کی فہرست دیکھ کر حیران رہ گیا۔اتنے متنوع اور ہمہ جہت مقالات ہیں کہ تقریباً ہر پہلو اس میں آگیا ہے۔ہر اعتبار سے سمینار کی کامیابی پر ذمہ داران مبارک باد کے مستحق ہیں۔

صدر اجلاس نے صدارتی خطاب میں کہا کہ جس نے بھی دارالمصنّفین کی خدمات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، پڑھا ہے سب بالکل سچ ہے۔سمینار اپنے مقصد میں ۹۵؍ فیصد کامیاب ہے۔ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ان دو دنوں میں معارف سے جتنے واقف ہوئے، پوری زندگی میں نہیں ہوئے۔صحیح معنوں میں معارف کی جو ادبی خدمات ہیں ہم تو اس سے بھی واقف نہیں تھے۔چاہے جتنے بھی بڑے ماہر اقبالیات وغالبیات ہوں اگر انہوں نے معارف کو

نہیں پڑھا ہے تو ان کا دعویٰ محلِّ نظر ہے۔ میں نے معارف اور غالبیات کے مطالعہ کے دوران معارف کو پڑھا تو حیران رہ گیا کہ ایسے ایسے انکشافات جن کو ہم کسی اور کا سمجھتے تھے وہ معارف کی دین ہیں۔

آخر میں پروفیسر ظلی نے کہا کہ مجھے یورپ اور امریکہ کے سمیناروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جتنے مقالہ نگار ہوتے ہیں اتنے ہی سامع۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں ہم چاہتے ہیں کہ ہال بھرا ہو۔ لیکن اس سمینار نے یہ خلش بھی شاید ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دی۔ کسی بھی سمینار کی کامیابی کے لیے بھیڑ ضروری نہیں ہے۔ ایک سخن شناس بہت سے سخن ناشناسوں سے بہتر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی یہ ایک بھرپور سمینار تھا، بیشتر مقالات معلومات افزا اور محنت سے لکھے گئے تھے۔ کیسی کیسی چیزیں اور معلومات ہمارے سامنے آئیں جن کے بارے میں خیال بھی نہیں تھا کہ معارف میں یہ چیزیں بھی شائع ہوئی ہوں گی۔ میں آپ سب کے اس مسلسل تعاون کا شکرگزار ہوں اور آپ کی ضیافت میں ہماری طرف سے جو کمی ہوئی ہو، اس کے لیے معافی کا خوستگار ہوں۔ اکیڈمی کے کارکنان، احباب، رفقاء اور پورے عملہ کا تہ دل سے ممنون و احسان مند ہوں جن کی شب و روز کی محنت اور توفیق ایزدی اگر شامل حال نہ ہوتی تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کا بہترین اجر دے۔ رسالہ معارف کو آپ اپنے تعاون اور دعاؤں سے نوازتے رہیں تاکہ یہ سلسلۂ فیض اسی آب و تاب کے ساتھ جاری رہے۔

اخبار علمیہ

''عظیم الشان مسجد کی تعمیر''

برٹش یونیورسٹی ٹاؤن آف کیمبرج میں ایک مسجد زیر تعمیر ہے۔جس کی بنیاد ۵/ستمبر ۲۰۱۶ء کو رکھی گئی۔اس منصوبہ کے آغاز و تکمیل میں ترکی نے اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ دراصل اس علاقہ میں رہائش پذیر تقریباً ۶ ہزار مسلمانوں کی ضرورت اور مطالبہ کو پیش نظر رکھ کر تعمیر کی جارہی ہے۔اس میں کل ۱۸ ملین امریکن ڈالر کے اخراجات کا اندازہ کیا گیا ہے۔افتتاح کے وقت اس کی سیمنٹ میں مقدس آب زمزم کا استعمال بطور تبرک کیا گیا ہے۔اس میں بیک وقت ۷ سے ایک ہزار مرد اور تقریباً تین سو عورتیں نماز ادا کرسکتی ہیں۔اس کی تعمیر میں عورتوں کا بھی خصوصی تعاون شامل ہے۔مسجد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اسلامی روایت کے مطابق جنازہ کی سہولت،ایک کیفے،بچوں کے لیے ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے آراستہ قرآن مجید سکھانے والے اسکول کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی باغ ہوگا جو تمام لوگوں کے لیے کھلا ہوگا اور جس میں ان پودوں اور پھلوں کو خاص طور پر اُگا یا جائے گا جن کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔مسجد میں ایسی جگہیں خاص کی جائیں گی جو عورتوں اور ان کے شیر خوار بچوں کے لیے ساؤنڈ پروف ہوں اور ان کے طبعی اور قدرتی علاج کے لیے بھی کمرے بنائے جائیں گے۔یہ پورا نظام سولر سسٹم پر مشتمل ہوگا،استعمال شدہ پانی کو قابل استعمال بنانے کی سہولت بھی ہوگی اور اس کے اندرونی ماحول کو قدرتی وسائل سے آراستہ کیا جائے گا،جس کی حفاظت کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔(ینگ مسلم ڈائجسٹ،اپریل ۲۰۱۷ء)

''نایاب کیڑے کی دریافت''

سائنسی جریدہ ''پی این اے ایس'' میں شائع شدہ خبر کے مطابق سائنس دانوں نے فلپائن میں پہلی بار زندہ نادر جہاڑی کیڑا پایا ہے جو لکڑی میں سوراخ کرکے جہاز پر اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔یہ پانچ فٹ لمبا اور ۶ سینٹی میٹر چوڑا ہے۔وہ ایک سخت خول میں تھا اور اس کا سر کیچڑ میں تھا جہاں سے وہ اپنی غذا حاصل کررہا تھا۔محققین کو اس کے وجود کا علم تو پہلے سے تھا تاہم اس کے زندہ نمونہ کا مطالعہ اب

تک نہیں ہوسکا تھا۔ اس کا اصل نام ''بیویلو'' ہے اور اس کا تعلق صدف یا سیپ کی نسل سے ہے۔ یہ اب تک کی انسانی معلومات میں سب سے طویل جہازی کیڑا ہے۔ امریکہ، فرانس اور فلپائن کے سائنس دانوں کی مشترکہ ٹیم کو خلیج منڈاونا میں یہ کیڑ املا۔ ملنے والا یہ کیڑا نہ صرف جسامت کے لحاظ سے نادر بلکہ خوراک کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کیوں کہ جہاز کے بجائے کیچڑ اس کی خوراک تھی، اس کی خاص بات یہ ہے کہ ایک مادے کے اخراج سے اپنا خول خود ہی تیار کرتا ہے اور سر کو ڈھکنے کے لیے ایک سخت غلاف بھی تیار کرتا ہے۔ (یہ خبر بی بی سی اردو ڈاٹ کام ۱۸/ اپریل کی اشاعت میں دیکھی جاسکتی ہے)

''ٹیچنگ ــــ ایڈس کی اہمیت''

ٹیچنگ ایڈس یعنی تدریسی معاون اشیا طلبہ کے اشکالات اور شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں بہت معاون ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ استاد مجرد، گنجلک اور پیچیدہ موضوعات کو نہایت سہل و آسان بنادیتا ہے۔ ان اشیا کے بروقت اور مناسب استعمال سے طلبہ کی اکتسابی صلاحیتوں پر مثبت اثرات کو نمایاں طور پر محسوس اور اکتساب کی شرح میں ترقی کو بھی آسانی سے نوٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون منصف حیدرآباد میں شائع ہوا ہے جس کے اہم مندرجات درج ذیل ہیں۔ مضمون میں درس وتدریس کے وہ وسائل جو اکتسابی عمل میں قابل قدر کردار کے حامل ہیں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان میں بلیک بورڈ، چارٹس، پوسٹرس اور فلینل بورڈ، نمونے، ہیڈ پروجیکٹرس اور ٹرانسپر ینسز، پروجیکٹر اور سلائیڈرز، کمپیوٹرس سے متعلق اشیا۔ مذکورہ وسائل کو نوعیت کے لحاظ سے تین درجوں میں بصری امدادی اشیا، سمعی امدادی اشیا اور سمعی وبصری امدادی اشیا، منقسم کرکے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بصری امدادی اشیا میں بلیک بورڈ، گراف، چارٹس، تصاویر، ماڈلس، نقشے، خاکے، فلم اسٹرپس، فلینل بورڈ، ہیڈ پروجیکٹر اور فلش کارڈ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان اشیا کے استعمال سے جہاں طلبہ کی قوت مشاہدہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے وہیں اس سے عملی تجربات اور نظری معلومات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سمعی امدادی اشیا میں ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو اور گراموفون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان امدادی وسائل میں طلبہ آواز کے ذریعہ سبق کے نکات کو سمجھتے ہیں۔ بصری وسمعی امدادی اشیا میں پروجیکٹر، ٹیلی ویژن، ڈراما، کمپیوٹرز،

لیپ ٹاپ، ٹیبلٹس، اسمارٹ فونس اور انڈرائیڈ فونس کی جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان وسائل کو آج کے دور میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان معاون اشیا کے استعمال سے حقائق طلبہ کے سامنے ازخود آجاتے ہیں۔ کوئی چیز صیغۂ راز میں نہیں رہ پاتی۔ ڈیجیٹل اور اسمارٹ کلاس روم اسی نظریہ کے تحت قائم کیے گئے ہیں۔ یہ اکتساب کو فروغ دینے کے علاوہ تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے میں بھی کلیدی کردار انجام دیتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں منصف حیدرآباد ۱۵/اپریل ۲۰۱۷ء)

''یوگ کی تعلیم کے نمبرات میں اضافہ''

یوپی بورڈ کے ۲۵ ہزار سے زیادہ اسکولوں میں درجہ ۹ سے ۱۲ تک کے تقریباً ایک کروڑ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ انہیں اب یوگ کی تعلیم کے لیے سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ رپورٹ کے مطابق یوپی بورڈ کی تعلیمی کمیٹی ہائی اسکول سطح پر یوگ کے نمبر کو ٦ سے بڑھا کر بیس اور انٹر سطح پر ملنے والے ۵ نمبر کو بڑھا کر ۲۰ نمبر کرنے پر اپنی رضامندی دے دی ہے۔ تعلیمی افسران کے مطابق یوپی بورڈ نے ہائی اسکول اور انٹر کی سطح پر یوگ کی تعلیم نئے سرے سے لاگو کرتے ہوئے اس کی کئی چیزوں کو شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ درجہ ۹ سے ۱۲ تک اخلاقیات اور صحت سے متعلق تعلیم کا امتحان میں ۵۰ نمبر کا ایک پرچہ لازمی ہوتا ہے۔ اس کے نمبر نتائج میں نہیں جوڑے جاتے ہیں۔ نمبر کے بجائے گریڈ دیا جاتا ہے۔ اسی پرچہ کے ساتھ یوگ کو بھی رکھا گیا ہے۔ ہائی اسکول میں ۵۰ میں سے ٦ اور انٹر سطح پر ۵ نمبر یوگ کے لیے ہیں۔ یوگ کے حصے کے نمبر بڑھا کر ۲۰ کر دینے کے بعد باقی حصے کے نمبرات میں بھی تبدیلی کی جائے گی۔ یوپی بورڈ کی سکریٹری کے بیان کے مطابق اخلاقیات اور صحت سے متعلق تعلیم کے لیے ۱۵/ ۱۵ نمبر ہوں گے۔ اس تجویز کو ۲٦/اپریل کو ہونے والی میٹنگ میں منظوری کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔ (ہندوستان اکسپریس، دہلی (صفحہ سب رنگ) ۲۱/اپریل ۲۰۱۷ء)

ک۔ص اصلاحی

تلخیص و تبصرہ

مغل دربار میں سنسکرت زبان وادب کی اہمیت

جناب اکرام الحق

زیر بحث کتاب ''کلچر آف انکاؤنٹرس: سنسکرت ایٹ دی مغل کورٹ'' ایک نوجوان اسکالر آدرے ترشکے کی تحقیق ہے جو کولمبیا، کیمبرج اور اسٹنفورڈ جیسی مشہور جامعات میں تحقیق و تدریس کی خدمات انجام دے چکی ہیں، ۲۰۱۶ میں شائع ہونے والی یہ کتاب دراصل اس پی ایچ ڈی مقالہ کی ترقی یافتہ شکل ہے جو مصنفہ نے "Cosmopolitan Encounters: Sanskrit and Parsian at the Mughal Court" کے عنوان سے ۲۰۱۲ میں کولمبیا یونیورسٹی، امریکہ میں تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب ۲۰۱۶ء ہی میں پہلے کولمبیا یونیورسٹی سے شائع ہوئی اور اب اسے Penguin Books India نے دہلی سے شائع کیا ہے۔

سنسکرت زبان وادب کا مغل دربار میں کیا مقام تھا؟ سنسکرت ادبا و اہل علم کے مغل حکمرانوں سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ سنسکرت زبان میں مدون قدیم ہندوستانی علوم سے مغل حکمراں خاندان اور طبقہ امرا کو کس طرح کا شغف تھا اور سلطنت مغلیہ کے فرمانرواؤں نے کیوں ان علوم کی سرپرستی کی؟ ہندوستان کی کلاسیکی زبان اور اس کے ادبی و تہذیبی سرمایہ نے کیوں کر مغل سلطنت کی سیاسی، ادبی، علمی، اور فلسفیانہ سرگرمیوں کو ایک نئی جہت عطا کی؟ یہ وہ چند بنیادی سوالات ہیں جو ابھی تک ہندوستانی مورخین کے دائرۂ تحقیق سے باہر تھے، حالانکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے مختلف تاریخی پہلوؤں اور اس کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے یہ سوالات انتہائی اہم ہیں۔ مصنفہ آدرے ترشکے (Audrey Truschke) نے، جو رتگرس یونیورسٹی۔ نوارک میں جنوب ایشیائی تاریخ کی پروفیسر ہیں، عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پوری علمی سنجیدگی کے ساتھ اپنی کتاب CultureofEncounters:

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ Mob.9013386953

Sanskrit at the Mughal Court میں پہلی بار ان سوالوں کی تحقیق کی ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کے بعض نکات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ہندوستانی تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ۱۹۸۰ء تک ہندوستانی مورخین کی تحقیقی کاوشیں بنیادی طور پر سیاسی نظام، انتظامی ڈھانچہ اور معاشی نظم ونسق کو سمجھنے تک محدود تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب مارکسی مورخین نے چند خاص نظریاتی بنیادوں پر ہندوستان کے عہد رفتہ کی تلاش وجستجو شروع کی تھی، جس میں معاشی درو بست اور سیاسی وانتظامی ڈھانچہ کے آپسی تال میل پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکسی طرز تاریخ نویسی نے نہ صرف یہ کہ ہندوستانی تاریخ کے متعدد پیچیدہ پہلوؤں کو جدید تاریخی اصولوں کی روشنی میں اجاگر کیا ہے، بلکہ ہندوستان کے شاندار ماضی کو فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کے عفریت سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اپنے محدود نظریاتی مفروضات کی وجہ سے یہ مورخین تاریخ کے ان امور پر کوئی خاص توجہ نہیں دے سکے جو کسی بھی تہذیب وثقافت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض اہم موضوعات جیسے مذہب اور اس کا فکری وعلمی ارتقا، لسانی وادبی روایت، فنون لطیفہ اور بین الثقافتی تبادلے (cross-cultural interactions) وغیرہ کبھی بھی ان کی بحث کا مرکزی حصہ نہیں رہے۔

۱۹۸۰ میں یہ فکری جمود ٹوٹا اور مارکسی تاریخی مفروضات کو حاصل غیر معمولی مقبولیت میں یکا یک گراوٹ آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فقط ایک دہائی میں متعدد ایسی کتابیں منظر عام پر آگئیں جنھوں نے تاریخ نویسی کے ایک نئے دور کی بنا رکھنے کے ساتھ ساتھ مارکسی انداز فکر کی کمر ہی توڑ دی۔ زیر نظر کتاب بھی اسی جدید سلسلۂ تاریخ نویسی کی ایک کڑی ہے، جو سلطنت مغلیہ میں سنسکرت زبان وادب کی اہمیت اور کردار کا تاریخی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

یہ کتاب دو پہلوؤں سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اول یہ کہ اس کتاب میں ایک نیا موضوع زیر بحث آیا ہے جو بالخصوص عہد وسطیٰ کی تہذیبی وثقافتی روایت کو سمجھنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ مصنفہ نے اس کتاب میں اس تاریخی جھوٹ اور سیاسی پروپیگنڈہ کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو اکثر وبیشتر عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کے خلاف کیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستانی اور سامراجی مورخین کی ایک بڑی جماعت نے اپنی تحریروں میں یہ الزام تراشی کی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ ہندوؤں

کو قتل کیا اور انہیں جبراً اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا، بلکہ قدیم ہندوستانی تہذیب کے سنہرے دور کو بھی ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا۔ ہندوستانی مورخین کے درمیان اس نظریہ کی مقبولیت کی وجہ بہت حد تک وہ فرقہ وارانہ زہر تھا جو آزادی سے قبل ہندوستان کی سیاسی، سماجی، اور علمی فضا میں سرایت کر چکا تھا۔

اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ گزشتہ چند برسوں میں یہ نفرت انگیز پروپیگنڈہ ایک مرتبہ پھر زور پکڑ چکا ہے۔ مصنفہ نے تاریخی دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عام مفروضہ کے برخلاف، سنسکرت ادبا و دانشوروں کو دربار مغلیہ میں خاص عنایات حاصل تھیں اور سنسکرت زبان اپنی تمام کلاسیکی روایات کے ساتھ مغل حکمرانوں کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی رہی۔

ذیل میں اس کتاب سے چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جس سے اس کی افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ مغل دربار میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

مغل حکمرانوں نے، جن کا فارسی کلچر سے بہت گہرا رشتہ تھا، فارسی کو ثقافتی اور انتظامی زبان کے طور پر ترقی دی۔ ۱۶ ویں صدی کے وسط سے انہوں نے فارسی زبان و ادب کو خوب تعاون فراہم کیا اور دربار مغلیہ کو تہذیب و ثقافت کا مرکز بنا دیا جہاں ایشیا کے مختلف حصوں سے فارسی شعراء و ادبا، دانشور اور فنکار کھنچے چلے آئے۔ اس کے علاوہ بادشاہ اکبر نے ۱۵۸۲ میں فارسی کو انتظامیہ کی سرکاری زبان کے طور پر لاگو کر دیا تاکہ سرکاری کام کاج میں یگانگت اور بہتری لائی جا سکے۔ مورخین نے بالعموم ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم سمجھا اور یہ باور کر لیا کہ ۱۵۸۰ کی دہائی سے مغل دربار میں فارسی کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی علوم کے ماہرین نے عام طور پر مغلیہ خاندان کو جہاں فارسی تک محدود کر دیا، جس میں کسی حد تک دوسری اسلامی زبانوں مثلاً عربی اور ترکی کا بھی رواج تھا۔ دانشوروں نے تقریباً بیک آواز مغلیہ سلطنت کی سیاسی، فکری و فنی اور ادبی سرگرمیوں کے ضمن میں سنسکرت ادب کی گراں قدر حیثیت کو نظر انداز کر دیا، جو ہندوستان کی کلاسیکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ مورخین کے اس رویہ نے بہت دنوں تک سنسکرت کی ثقافتی روایت سے مغلیہ خاندان کے دیرینہ رشتے کو پردہ خفا میں رکھا اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا کثیر ثقافتی (multicultural) پہلو لوگوں سے پوشیدہ رہا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب مغلوں نے فارسی کو انتظامی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا، حکمران طبقہ کے سربرآوردہ افراد نے سنسکرت ادبا، اہل علم اور سنسکرت کتابوں سے اپنا رشتہ بدستور قائم رکھا۔

۱۵۶۰اور ۱۵۷۰کی دہائی میں پورے برصغیر سے سنسکرت دانشور مغل دربار میں داخل ہوئے۔ ۱۵۸۰کی دہائی تک جین اور برہمن مفکرین کی ایک بڑی تعداد مغل دربار کا حصہ بن چکی تھی۔ مغلوں نے ان دونوں جماعتوں کے دانشوروں کو اعزازات سے نوازا اور سنسکرت کتابوں کی تدوین و اشاعت کے لیے بے مثال حد تک تعاون کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ، شاہی فرمان کے مطابق، دربار میں موجود اہل علم نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور سنسکرت علوم کے تئیں اپنے تاثرات اور خیالات بھی آزادانہ طور پر قلم بند کیے۔ سنسکرت زبان کی بابت مغلوں کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مقامی حکمراں اور دوسری جماعتوں نے بھی سربراہان سلطنت مغلیہ کی شان میں قصیدے لکھوائے اور دربار میں سنسکرت دانشوروں کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ یہ سرگرمیاں جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد میں بھی جاری رہیں اور ۱۷ویں صدی کے وسط تک باقی رہیں۔ چنانچہ اس طرح سنسکرت زبان اور اس کی ادبی روایات فارسی کے شانہ بہ شانہ مغل دربار میں ترقی پاتی رہی۔(۱)

مصنفہ آدرے ترشکے نے دربار مغلیہ میں سنسکرت زبان کے چلن کے حوالے سے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے، جو غالباً اس کتاب کی نظریاتی اساس بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مغل سلطنت شروع سے ہی ایک کثیر لسانی اور کثیر مذہبی ریاست (multi-lingual and multi-religious state) تھی۔ چنانچہ مغل حکمرانوں کو فقط فارسی زبان و ادب اور مذہب اسلام کی تنگ نظر طرف داری کی حدود میں مقید کرنا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ سلطنت مغلیہ کے بانی بادشاہ بابر کو فارسی اور ترکی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ اس نے اپنی سوانح حیات بھی چغتائی ترکی میں لکھی تھی۔ عہد اکبری میں شاہی کتب خانہ میں عربی، کشمیری، ہندی، یونانی، اور دیگر یوروپی زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی کتابیں بھی موجود تھیں۔ حال میں مغلیہ سلطنت پر ہونے والی نئی تحقیقات سے بھی مصنفہ کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے تئیں مغلوں کے رویہ کو اجاگر کرتے ہوئے السن بش (Allison Busch) اپنی تحقیق میں واضح کر چکی ہیں کہ مغل دربار میں ہندی ایک ادبی اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ چونکہ بہت کم اہل علم سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے، اس لیے بول چال کی سطح پر غالباً ہندی ہی وہ زبان تھی جو فارسی ادبا اور سنسکرت دانشوروں کے درمیان تبادلہ خیال کا واحد وسیلہ تھی۔

عہد جہاں گیری میں سنسکرت زبان و ادب کی شاہانہ سرپرستی کی تشریح کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

جہاں گیر نے سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ اس وقت بھی کروایا جب وہ شہزادہ تھا اور ۱۶۰۵ میں تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ اس بین الثقافتی سرگرمی سے وابستہ رہا۔ اس نے دربار میں جین اور برہمن دونوں جماعتوں کے دانشوروں کی حوصلہ افزائی کی اور شاہی کتب خانہ میں سنسکرت کتابوں کو جگہ دی۔ جہاں گیر نے اپنے والد بادشاہ اکبر کے حکم کے مطابق چند سنسکرت کتابوں کے ترجمے بھی پڑھے، حتیٰ کہ ایک ترجمہ پر اس نے حواشی بھی لکھے تھے۔ اس سے حکمران طبقہ میں سنسکرت کتابوں سے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں گیر جین مذہبی لیڈروں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ مگر اختلاف رائے کے سبب مغلیہ سلطنت اور جین سادھوؤں کے درمیان تعلقات ۱۶۱۰۔ ۱۶۲۰ کے دوران کشیدہ ہو گئے تھے۔ جہاں گیر کا دربار ان لوگوں کے لیے بھی کشش کا مرکز تھا جو قدیم سنسکرت داستانوں کو از سر نو فارسی زبان میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔

شاہ جہاں کے عہد میں بالآخر سنسکرت ایک اہم علمی، ادبی، اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے مغل دربار سے رخصت ہونے لگی۔ لیکن شروع میں یہ دور بھی بین الثقافتی ایکسچینج کا محور تھا۔ جگن ناتھ پنڈت راج اور کویندر آچاریہ سرسوتی، جو ۱۷ویں صدی کی مشہور ترین اور بااثر سنسکرت شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے، شاہ جہاں کے ان سے اچھے تعلقات تھے۔ جگن ناتھ پنڈت پرانے درباری تھے اور کئی دہائیوں سے مغلوں کی سرپرستی میں سنسکرت کتابیں لکھ رہے تھے۔ کویندر آچاریہ کے شاہ جہاں سے کس طرح کے تعلقات تھے اس کی مکمل تفصیل معلوم نہیں، البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہندوؤں پر لاگو ایک زیارتی ٹیکس کو ختم کروانے میں وہ کامیاب رہے تھے۔ ان کو درباری وظیفہ بھی ملتا تھا۔(۲)

۱۷ویں صدی کے دوسرے نصف سے سنسکرت زبان کو وہ شاہانہ سرپرستی نہیں حاصل رہی جو عہد اکبری سے عہد شاہ جہانی تک مجموعی طور اس کو میسر تھی۔ اس تاریخی تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے آدرے ترشکے رقم طراز ہیں:

مغلیہ سلطنت کے ایک اہم ثقافتی عنصر کی حیثیت سے سنسکرت زبان کی زوال پذیری کے دو اسباب تھے، ایک لسانی اور دوسرا سیاسی۔ اول یہ کہ ہندی ایک ادبی زبان کے طور پر ۱۷ ویں صدی میں خوب ترقی کر رہی تھی اور بڑی تیزی سے ثقافتی اور تہذیبی میدان میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھی جس پر کل تک صرف سنسکرت کا قبضہ تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندی اچانک عہد شاہ جہانی کے دور آخر میں ظاہر ہوئی تھی،

بلکہ یہ اکبر کے عہد سے ہی مغل دربار میں فکری اور ادبی تخلیقات کا سرگرم وسیلہ تھی۔ مگر ۱۷ویں صدی کے وسط سے ہندوستانی ادبا کی ایک کثیر تعداد علاقائی زبانوں سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے لگی تھی۔ اس تبدیلی کے پیش نظر مغل حکمرانوں نے بھی قدیم ہندوستانی علوم کی معرفت کے لیے سنسکرت ادب سے نظریں پھیر لیں اور ہندی پر توجہ مبذول کی۔ مغلیہ شاہی خاندان اور طبقہ امراء دونوں نے ۱۷ویں صدی کے دوسرے نصف سے ہندی شعرا اور موسیقاروں کی سرپرستی شروع کردی، جبکہ ۱۶۵۰ کے بعد سے ہی وہ سنسکرت دانشوروں کو کسی بھی طرح کی مستقل حمایت دینے سے باز آچکے تھے۔

وہیں جب ۱۶۵۸ میں اورنگ زیب عالم گیر تخت شاہی پر قابض ہوا، تو اس نے مغل دربار اور سنسکرت ادبا و اہل علم کے درمیان بچے کھچے رشتے بھی ختم کر دیے۔ بظاہر یہ فیصلہ اورنگزیب کی اس تصویر کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے جو ایک متعصب اور ظالم بادشاہ کی شکل میں عام طور پر لوگوں کے ذہن میں گھر کر چکی ہے۔ حالانکہ یہ اورنگ زیب کی طرف سے ایک سوچا سمجھا سیاسی قدم تھا۔ اورنگ زیب شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا تھا، جو اپنے بڑے بھائی اور ولی عہد سلطنت دارا شکوہ کو شکست دے کر تخت شاہی پر بیٹھا تھا۔ ۱۶۴۰ اور ۱۶۵۰ کی دو دہائیوں میں دارا شکوہ نے قابل رشک حد تک بین الثقافتی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی تھی، جن میں کچھ منتخب اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ اور مجمع البحرین نامی وہ رسالہ بھی شامل تھا جس میں دارا شکوہ نے ہندو اور مسلم تصورات کے مابین ہم آہنگی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی........ اورنگ زیب کے نظریے کی رو سے یہ قدم اس لیے اہم تھا کیونکہ وہ جہاں سنسکرت سے ہر طرح کے شاہانہ رشتے کو منقطع کر کے اپنے بڑے بھائی کی تہذیبی وراثت سے اپنی ثقافتی روایت کو ممتاز کرنا چاہتا تھا۔ (۳)

یہ کتاب اسکالرس، طلبہ اور ان تمام لوگوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں جو ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے ایک نئے پہلو سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ یہ کتاب عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری، علم دوستی اور ہندوستان کی دیرینہ روایات سے والہانہ شیفتگی کی سچی داستان ہے۔

حواشی

(۱) آدرے ترشکے، کلچر آف انکاونٹرا یٹ دی مغل کورٹ، پینگوئن، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۳-۴۔ (۲) ایضاً، ص ۱۵۔ (۳) ایضاً، ص ۱۵-۱۶۔

ادبیات

دیار حبیب ﷺ کا شوق سفر

جناب وارث ریاضی

دیار قدس کا عزم سفر ہے مگر یہ مرحلہ دشوار تر ہے

اسی جانب نگاہیں اٹھ رہی ہیں حریم حسن کا جلوہ جدھر ہے

بسا ہے گنبد خضرا نظر میں نگاہ شوق بے تاب نظر ہے

دل محزوں ہے شیدائے مدینہ مگر منزل رسی سے بے خبر ہے

کوئی غم خوار ہے اپنا نہ ہم دم ضعیفی ہے نظر کم زور تر ہے

نہ مال و زر نہ طاقت ہے نہ ہمت نہال زندگانی بے ثمر ہے

مریض ناتواں ہوں، ساتھیوں سے بہ ہر لحہ بچھڑ جانے کا ڈر ہے

ابھی حالات بھی ہیں نامساعد نظام امن عالم منتشر ہے

جہاں میں ہر طرف شورش ہے برپا حرم کی سرزمیں بھی پُر خطر ہے

عجب اسلام کی دنیا ہے بے بس مسلسل کش مکش در خیر و شر ہے

مگر پھر بھی وہاں پہنچوں گا وارثؔ کہ دل میں الفت خیر البشرؐ ہے

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار۔ Mob: 8228902548

مطبوعات جدیدہ

گنجینۂ معنی کا طلسم (مطالعۂ غالب): از ڈاکٹر اسلم پرویز، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۱۵۰/روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

کل بارہ مضامین ہیں جن میں غالب کی زندگی، شخصیت، اشعار، افکار، اقدار، عصر، سفر، شاگرد، شارح، روایت، جدت جیسے پہلو اور گوشے ہیں جن کا سامنا جہان غالب کی سیر میں عموماً کیا ہی جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مطالعہ، بصیرت کی فراوانی سے وہ مشاہدہ بن جائے جہاں الفاظ کے طلسم کے پرے دیکھنے والے کے لیے معانی کے ایک خزانہ کی یافت کا حیرت انگیز منظر، اس سیر کو سیر حاصل بنادے۔ غالبیات کا عالم بھی عجیب ہے، جہاں سیاحوں کی کثرت اور ان کی متنوع صلاحیت کے باوجود ہمیشہ کچھ گوشے کسی صاحب نظر سیاح کی آس میں منتظر، نظر آتے ہیں، اس مجموعہ مضامین سے اس خیال کی تائید اور توثیق دونوں ہوتی ہے، یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ یہ مضامین پچاس سال کی سیر غالب کا نتیجہ ہیں، پیش لفظ میں اسی بات کو ایسی پچاس سالہ رفاقت سے تعبیر کیا گیا جو خود سپردگی سے اس لیے عبارت نہیں کہ اس میں تعداد کی کثرت نہیں اور مزاج میں اختلاف بھی نہیں، اس اظہار خیال پر کسی خیال کے اظہار کی ضرورت نہیں، تاہم موضوعات کے انتخاب میں یہ کہنا کہ اس میں خارجی جبر کا دخل نہیں، یہ ضرور اسلوب کا طلسم ہے جو غالب کے اشعار کے لیے ہی روا رکھا جاسکتا ہے، فاضل مصنف نے غالب کے ایک شعر کی تفہیم میں کچھ ایسی ہی بات کہی کہ ''غالب جیسے عظیم شاعر کا یہ مرتبہ نہیں کہ وہ اپنے اشعار کے مطالب بھی پڑھنے اور سننے والوں کو بتاتا چلے۔ یہ اپنے خط کو آپ پہنچانے والی بات ہے''۔ ذرا توسع سے کام لیا جائے تو یہی بات نقادوں کے حق میں بھی جاتی ہے، ایک مضمون میں اسی طرح کی ایک اور مزہ کی بات آگئی، بات تو فارسی کے پورے اور اردو کے ادھورے شاعر غالب کی تھی، کہا گیا کہ ''اردو کا شاعر غالب اپنے آپ میں ادھورا نہیں بلکہ وہ اس قاری کے لیے ادھورا ہے جو اس کی فارسی شاعری سے نابلد ہے''۔ لیکن اصل لطف تو اس مضمون میں ہے جہاں غالب کو دین و دانش کے درمیان دیکھا گیا، اس کشمکش میں تہذیبی شناخت سے مدد لی گئی اور جملہ معترضہ ہی کے طور پر اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ ''اسلام دنیا کے ان مذاہب سے ہے جس میں تہذیبی شناخت کے ایسے پختہ نشانات ہیں جو محض عقیدہ کے کمزور ہونے یا ختم ہونے سے مٹ نہیں جاتے''۔ اسی مضمون میں یہ بات بھی آگئی کہ بڑی شاعری، داخلی اور خارجی خلفشار سے پیدا ہوتی ہے اور وہ بجائے خود بھی ایک طرح کا خلفشار ہی ہوتی ہے، دلیل بھی ہے

کہ ع شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش، اس لیے یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ ''مذہبی معتقدات سے رفض و علاحدگی بھی شوریدہ سروں کے علاوہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں''۔ اس جملہ میں علاوہ کی جگہ سوا کا لفظ شاید زیادہ مناسب ہو۔ نظر کے بانکپن یا اس کے تیکھے ترچھے ہونے سے مطالعہ کبھی کبھی واقعی ایسا ہوتا ہے کہ قاری خود کو دام حیرت میں برنگ طائر دیکھنے لگتا ہے، شعر غالب میں علامت ہو یا اس کی شکست آواز یا پھر غالب و مومن کی بات ہو، ہر جگہ مطالعہ کی قید سے رہائی کی صورت نظر نہیں آتی، غالب اردو کے بڑے شاعر اور مومن اردو کے اچھے شاعر، اس مقدمہ کا نتیجہ بھی بہت دلچسپ ہے، غالب اور انگریزی والا مضمون فاضل مصنف کی ابتدائی تحریر ہے، لیکن آج بھی اس کی انفرادیت باقی ہے، انگریزی الفاظ یا اصطلاحات کا استعمال غالب کے لیے ناگزیر رہا ہوگا لیکن ان کا یہ جملہ مزہ دے گیا کہ ''البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کوئن پوئیٹ گنا جاؤں''۔

اقبال اور دبستان شبلی: از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۰۰/روپے، پتہ: ادبی دائرہ، رحمت نگر، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ اور مکتبہ دارالمصنفین۔

دارالمصنفین کے ذکر میں بلکہ اس کی پوری تاریخ میں علامہ اقبال کا نام مختلف حیثیتوں سے بار بار آتا ہے، علامہ شبلی سے ان کے متاثر ہونے کا اعتراف تو بعد میں کیا گیا خود علامہ شبلی کا یہ قول نوجوان اقبال کے لیے واقعی کسی بڑی سے بڑی سند سے کم نہیں کہ ڈاکٹر اقبال کا علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا، علامہ شبلی نے اقبال کی گلپوشی کی تو شاہ سلیمان پھلواروی نے اس کو بہت مبارک موقع سے تعبیر کیا، شبلی کے دست مبارک کی برکت تھی کہ علامہ اقبال نے دارالمصنفین، معارف اور سب سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے ہمیشہ گلہائے عقیدت کا نذرانہ پیش کیا، اسی باہمی ربط اور اعتراف علم و فضل کا نتیجہ تھا کہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ''اقبال کامل'' کتاب نکلی جو اقبال شناسی کی گویا خشت اول ہے، معارف کے صفحات پر اقبال کے اشعار وخطوط، علم وادب و دانش کی روشنی بکھیرتے رہے اور خود کلام و پیام اقبال کی تبلیغ و توسیع کے لیے بے شمار اور بے حد وقیع مضامین و مقالات شائع کیے جاتے رہے، دارالمصنفین اور معارف یا بقول مصنف دبستان شبلی سے تعلق کی یہ پوری داستان سننے کے لائق تھی، خوشی ہے کہ لائق مصنف نے داستان سنانے کا یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔ سید صاحب کے نام علامہ اقبال کے خطوط بھی موضوع کی مناسبت سے جمع کردیے گئے۔ وسعت مطالعہ، اخذ مطالب اور بیان کی خوش سلیقگی، مصنف کی تحریروں کی شناخت ہے، یہ کتاب بھی اسی خوبی کی شاہد ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

بے گناہ قیدی: عبدالواحد شیخ، فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹیڈ، ڈی۔ ۸۴۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

خیر کثیر: ایلاف خیری، ڈاکٹر رؤف خیر، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد اور حیدرآباد کے دیگر مکتبے۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

دیوان آسی المعروف بہ عین المعارف: ترتیب فانی گورکھپوری، تحقیق ونظر ثانی ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی، شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ قیمت=/۴۰۰ روپے

رفاقت کی خوشبو: مقصود احمد مقصود آسی، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، پانکورنا کہ، احمد آباد، گجرات، ہند۔ قیمت=/۱۸۰ روپے

عجالۂ نافعہ: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مترجم مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، الحاج سید شان احمد صاحب، سجادہ نشین دربار مانئہ، غازی پور۔ ہدیہ

عزیز احمد قلم کار خوش قد (تنقید): رؤف خیر، ڈاکٹر رؤف خیر، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

غالب اور غالبیات: پروفیسر عبدالحق، ۲۳۱۵ ہڈسن لائن، کنگزوے کیمپ، دہلی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

کاروان قلم: ڈاکٹر حسن الدین احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ قیمت=/۱۶۰ روپے

مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن (پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کے مضامین): مرتبہ پروفیسر اختر الواسع، البلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ قیمت=/۱۲۰ روپے

منزل ما دور نیست (طلبائے برج کورس کی خودنوشت تحریریں): مرکز برائے فروغ تعلیم وثقافت مسلمانان ہند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت درج نہیں

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعرالعجم اول	150/-
شعرالعجم دوم	130/-
شعرالعجم سوم	125/-
شعرالعجم چہارم	150/-
شعرالعجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس ودبیر		100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		180/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
شذرات شبلی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
May 2017 Vol - 199 (5)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-